تعیّنات

مضامین

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

تعیّنات

(مضامین)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

❖

میں اپنے کعبۂ دل کو سجا کے بیٹھا ہوں
اُتر کے آئے گا وہ شخص آیتوں کی طرح

(شبیہ الحسن)

تعیّنات

(مضامین)

○

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

○

اظہار سنز

۱۹۔اُردو بازار، لاہور

حقوق اشاعت محفوظ

۲۰۱۱ء

تعیّنات

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن

ناشر

سید اظہار الحسن رضوی

طابع

سید محمد علی انجم رضوی

مطبع

اظہار سنز پرنٹرز، ریٹی گن روڈ، لاہور

کمپوزنگ

تصور کمپوزنگ سنٹر ۱۰۸۔ لٹن روڈ لاہور

قیمت ۲۵۰ روپے

یکے از مطبوعات

اظہار سنز ۱۹۔ اُردو بازار، لاہور۔ فون ۳۷۲۳۰۱۵۰

انتساب

عصرِ حاضر کے

دو معروف تخلیق کاروں اور بے پناہ محبت کرنے والوں

جناب امجد اسلام امجد اور جناب عطاالحق قاسمی

کے نام

madlib.org

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی چند اہم کتب

- مفاہیم (تحقیقی و تنقیدی مقالات)
- ترجیحات (تحقیقی و تنقیدی مقالات) (انعام یافتہ)
- اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار (تحقیقی و تنقیدی مقالات)
- تصریحات (تحقیقی و تنقیدی مقالات) (انعام یافتہ)
- ترغیبات (تحقیقی و تنقیدی مقالات)
- جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ (تحقیق و تنقید)
- مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی (تحقیق و تنقید)
- سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں (تحقیق و تنقید)
- طاہرین (سیّد وحید الحسن ہاشمی کی نعتیں، مناقب اور سلام۔ تجزیہ و تدوین)
- العطش (سیّد وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کا تجزیہ و تدوین)
- آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی (تحقیق و تنقید)
- باقیاتِ آلِ رضا (سیّد آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین)
- آغا صاحب (ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت و فن)
- کلیاتِ حبیب (حبیب جونپوری کے کلام کی تدوین)
- شام و سحر کی باتیں (ماہنامہ "شام و سحر" لاہور کے اداریے)
- قیصرِ اقلیم مرثیہ (تحقیق و تنقید)
- جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی (شخصیت و فن)
- سیف زلفی کے مرثیے (تجزیہ و تدوین)
- قیصر بارہوی کے مرثیے (قیصر بارہوی کے تریپن مرثیوں کی تدوین)
- حسن عسکری کاظمی کی تخلیقی جہتیں (تحقیق و تنقید)
- ادبی بیٹھک (ادبی کالم)
- ادبی چوپال (ادبی کالم)
- مضافاتی شعر و ادب (تحقیق و تنقید)
- اردو شعر و ادب کے سفیر (تحقیق و تنقید)
- اردو شعر و ادب کی معمار خواتین (مضامین)

مندرجات

ادھوری باتیں — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن — ۹

❖ پہلا مضمون

پیغمبر شعروسخن۔ مصطفٰے زیدی — ۱۱

❖ دوسرا مضمون

لکھنوی تہذیب کا آخری چراغ۔ سید آلِ رضا — ۳۰

❖ تیسرا مضمون

ڈاکٹر آغا سہیل کی افسانہ نگاری — ۵۱

❖ چوتھا مضمون

ایک گمشدہ تہذیب کا باشندہ۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان — ۷۰

❖ پانچواں مضمون

حفیظ تائب اور حبِ محمدؐ و آلِ محمدؐ — ۸۷

❖ چھٹا مضمون

ڈاکٹر سلیم اختر ایک تہذیبی خاکہ نگار — ۹۶

❖ ساتواں مضمون

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے 'آشوب' میں عصری آشوب — ۱۱۴

❖ آٹھواں مضمون
طالب جوہری کے شعری جواہر ۱۴۶
❖ نواں مضمون
غضنفر عباس کی شعری کائنات ۱۶۳
❖ دسواں مضمون
صحرائے قطر کا آہو۔ محمد ممتاز راشد ۱۷۲
❖ گیارھواں مضمون
اقبال حیدر کی مرثیہ نگاری۔ چند معروضات ۱۸۵
❖ بارھواں مضمون
کچھ ڈاکٹر محمد ہارون قادر کے بارے میں ۱۹۶
❖ تیرھواں مضمون
عرفی ہاشمی کے جدید مختصر مرثیے ۲۱۳
❖ چودھواں مضمون
انسانی جذبات کا عکاس شاعر۔ ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی ۲۳۹
❖ پندرھواں مضمون
ڈاکٹر ابوالحسن نقوی کے مرثیوں میں عصری حسیت ۲۴۸
❖ سولھواں مضمون
معاشرتی کرب اور ساجد پال ساجد ۲۶۳
❖ سترھواں مضمون
''اعجازِ مودّت'' کی معجز نمائیاں ۲۶۸

◆◆◆

ادھوری باتیں

ماضی پرست ناقدین کا المیہ یہ ہے کہ حال سے ان کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ماضی کے تمام تخلیق کار تو ان کی چشم بصیرت میں معتبر مقام کے حامل ہوتے ہیں جبکہ موجودہ عہد کے لکھنے والے انہیں کم معیار معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرزِ احساس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ماضی کی روایات کو تو زندہ و تابندہ رکھنے کی خواہش کرتے ہیں لیکن ان میں عصرِ حاضر کا لہو شامل کرنے کے لیے کدو کاوش نہیں کرتے۔ اس صورتِ حال میں ادب و شعر کی ترقی مزید سست رفتار ہو جاتی ہے اور تازہ افکار و نظریات اس عظیم روایات کا حصہ نہیں بن پاتے۔ میرے خیال میں وہ تخلیقی شہ پارہ صاحبانِ فکر و نظر کی نگاہ میں کبھی اعتبار حاصل نہیں کر پاتا جس میں ماضی کی روشن روایات، حال کی دیدہ وری اور مستقبل کی خیال آرائی موجود نہ ہو۔ عظیم تخلیق کار وہی کہلانے کا اہل ہے جو ماضی، حال اور مستقبل کو اپنی تخلیق میں یکجا کر دے۔ ''تعینات'' میں موجود تمام تخلیق کاروں میں یہ صفت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

''**تعینات**'' بنیادی طور پر اپنے عہد کے تخلیق کاروں سے مکالمہ ہے۔ میں نے اپنے ہر ممدوح کی کتاب سے گفتگو کی ہے اور خود اس سوال کا کھوج لگایا ہے کہ اس صاحبِ فہم و فراست نے ہمارے عہد کے کن اہم مسائل و معاملات کو پیش کیا ہے اور کس طرح اپنے ناخنِ تدبیر سے ان پیچیدہ گرہوں کو کھولنے کی مشکور سعی کی ہے۔ آپ کے نزدیک تعینات کسی سماجی ناقد کے مضامین کا مجموعہ ہو سکتا ہے لیکن میرے نزدیک یہ ایک نئی تخلیقی ادبی ریاست کا ''ابتدائیہ'' ہے۔ یہی سبب ہے کہ میں نے ''تعینات'' میں شامل ہر مضمون کے آغاز میں سماج کے کسی نہ کسی اہم رویے کی نشاندہی کی ہے اور احساس دلایا ہے کہ ایک معتبر تخلیق کار ہی ان مسائل پر قابو پا سکتا ہے۔ ہمارے عہد کے تخلیق کاروں کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقات میں روحِ عصر بھر دیں تاکہ آنے والے

زمانوں میں اس کی گونج سنائی دے۔

میرے لیے یہ برس آغاز ہی سے اچھا ثابت نہیں ہوا۔ والد ماجد سید وحید الحسن ہاشمی کی رحلت اور ہمشیر محترمہ شمع فاطمہ کی وفات نے مجھے حواس باختہ کر دیا ہے۔ دلوں میں رہنے والے جب دور بہت دور بستیاں بسا لیتے ہیں تو انسان کی نگاہیں اردگرد سے بے خبر ہو کر خلاؤں میں گردش کرتی رہتی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جب سروں سے سائبان ہٹتے ہیں تو اسی وقت دھوپ کی حدت کا علم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ میری والدہ ماجدہ کو سلامت رکھے کہ اب میں انہی کی دعاؤں کے سہارے زندگی کا سفر طے کر رہا ہوں۔ میں اپنے ان تمام محبین کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے زندہ رہنے کا عزم و حوصلہ عطا کیا۔ میں آج بھی اُن کی دعاؤں کا طلب گار ہوں۔

"تعینات" کی تشکیل و تعمیر میں ڈاکٹر نواز حسن زیدی، ڈاکٹر فرقان قریشی، پروفیسر انیقہ سلیم اور پروفیسر آنسہ سلیم نے ہر مقام پر میری دستگیری فرمائی۔ میری زوجہ (سیماب رضوی) اور بچوں (ایما حسن، وجیہ الحسن) نے میرے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا۔ تصور حسین صاحب، انجم رضوی صاحب اور جناب اظہار الحسن رضوی نے اس کتاب کو خوب سے خوب تر بنانے میں میرے ساتھ بے پناہ تعاون کیا۔ آسٹریلیا میں مقیم میری بیٹی اشا حسن، ننھے فرزند موسیٰ سلمہ، اس کے شوہر زین سلمہٗ اس کے سسر رفعت محسن صاحب اور ساس صاحبہ نے آسٹریلیا کے قیام میں مجھے پر سکون ماحول عطا کیا اور میرے لیے ہمہ وقت دعا کی۔ میں اپنے تمام احباب اور محسنین کا شکر گزار ہوں اور ان کے لیے صمیم قلب سے دعا گو ہوں۔ میں یہ کتاب اپنے دو محبین جناب امجد اسلام امجد اور جناب عطاالحق قاسمی کے نام معنون کر رہا ہوں۔ میں آج آپ سے ادھوری باتیں کر رہا ہوں کہ میرا ذہن ابھی تک منتشر ہے لیکن مجھے اطمینان ہے کہ میری بات آپ کے اذہانِ عالیات میں محفوظ ہو رہی ہے بقول یاس یگانہ:

بات ادھوری مگر اثر دونا
اچھی لکنت زبان میں آئی

(ڈاکٹر) سید شبیہ الحسن
۲۳ مارچ ۲۰۱۱ء

رابطہ
۲۵۳۔ ایف رحمان پورہ لاہور
موبائل ۰۳۳۳۔۴۲۵۵۱۵۴

❖❖❖

پیغمبرِ شعر و سخن۔ مصطفےٰ زیدی

شاعری محض لفظوں کو سلیقے سے برتنے ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں نادیدہ جذبات و احساسات کی پیش کش بھی ہوتی ہے۔ شاعر محض ایک نقال نہیں ہوتا کہ وہ مصور کی طرح چیزوں اور مناظر کو ہو بہو پیش کر دے بلکہ وہ دیکھی ہوئی چیزوں میں اپنے جذبات و احساسات کو شامل کر کے اسے نئی معنویت عطا کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب **افلاطون** نے شاعری کو نقل کی نقل کہہ کر اسے مہذب معاشرے کے لیے ابتر قرار دے دیا تھا تو اس کے شاگردِ رشید **ارسطو** نے واضح کیا تھا کہ اپنے جذبات و احساسات کو شامل کر کے شاعر نقل کی نقل نہیں کرتا بلکہ ''تخلیقِ نو'' کرتا ہے اور کسی بھی مثالی ریاست کے لیے ''نئی تخلیق'' ہرگز ہرگز مضر نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ کسی بھی مہذب و متمدن معاشرے میں جذبات و احساسات کی بے حد اہمیت ہوتی ہے اور حساس شاعر جب قواعد و ضوابط کو پسِ پشت ڈال کر اپنی سوچ اور فکر کو عوام کے سپرد کرتا ہے تو نئے نئے قرن زمانے اور تازہ زمانے وجود میں آتے ہیں۔ **لون جائینس** وہ پہلا صاحبِ طرز مفکر تھا جس نے اطالوی نقادوں کی قواعد پرستی اور ارسطو کے مقرر کردہ منطقی معیاروں کو کم اعتبار قرار دے کر جذبات اور تخیل کی عظمت اور افادیت کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اسی طرزِ احساس کے عث **سکاٹ جیمز** نے لون جائینس کو پہلا رومانوی نقاد قرار دیا ہے۔ سچی بات تو یہ

ہے کہ تہذیب یافتہ معاشرے میں سرد عقلیت زدہ ادبی رویوں کی بیخ کنی بے حد ضروری ہوتی ہے اور یہ جذبات، تاثیر اور وجد آفرینی کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ لان جائنس کا افتخار یہ ہے کہ اس نے پہلی مرتبہ ادبی شہ پاروں کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے فطری اور طبعی قوانین، انسانی سیرت و کردار کی عظمت کے اصولوں، حکمت و دانش سے بھرپور فلسفیانہ اور نفسیاتی حقیقتوں اور صداقتوں کو قابلِ توجہ گردانا۔ اس نے واضح کر دیا کہ وہی شہ پارہ عظمت سے ہم کنار ہو گا جو ارفعیت (Sublimity) سے مالا مال ہو گا۔ اس کے نزدیک عظمتِ خیال، شدید اور قوی جذباتی تاثر اور پروقار زبان ارفعیت کے بنیادی منابع ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب شدید جذبات عظیم خیالات کے سائے میں پرتاثیر زبان کی مدد سے وجود میں آتے ہیں تو معتبر شاعری ظہور میں آتی ہے۔ اردو میں **مصطفےٰ زیدی** وہ منفرد اور یگانہ طرز کے شاعر ہیں جنہوں نے اپنے شدید ترین جذبات کے برملا اظہار سے اقلیم شاعری میں شہرت و عظمت حاصل کی اور اردو شاعری کو اپنے زریں افکار سے مالا مال کر دیا۔

آتشِ حسن بھی تھی تابشِ دنیا بھی مگر
شعلہ جس نے مجھے پھونکا مرے اندر سے اٹھا

مصطفےٰ زیدی کا اسم گرامی سید مصطفےٰ حسنین تھا۔ آپ ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۳۰ کو الٰہ آباد کے ایک علمی، ادبی اور دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ میٹرک، ایف۔ اے اور بی۔ اے کے امتحانات امتیازی حیثیت میں پاس کیے۔ زمانہ طالب علمی ہی سے شعر و ادب سے ربط قائم ہوا۔ ابتداً جوش اور فراق کی شاعری سے بے حد متاثر ہوئے اور تیغ الٰہ آبادی کے نام سے شاعری شروع کی۔ انہوں نے برصغیر کے حالات و واقعات کا عمیق نگاہی سے مطالعہ کیا اور بدلتے ہوئے سیاسی، معاشی، سماجی اور مذہبی رویوں کو اپنے مذاق و مزاج حصہ بنایا۔ مصطفےٰ زیدی کے کلام میں بلند آہنگی، جوش اور طنطنہ دراصل اسی دور کی دین ہے تقسیم برصغیر کے بعد وہ پاکستان تشریف لائے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے

انگریزی کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ تدریس کے پیشے سے منسلک رہے اور ۱۹۵۴ء میں سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہو کر ملک کے مختلف مرکزی و مضافاتی علاقوں میں تعینات رہے۔ اسی دوران ٹریننگ کے لیے وہ مختلف مشرقی و مغربی ممالک میں تشریف لے گئے اور ہر ملک کی تہذیب و ثقافت کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کیا۔ اس طرز عمل نے مصطفےٰ زیدی کے قلب و نظر میں کشادگی پیدا کی۔ انہوں نے جرمن نژاد خاتون ویرا فان بل سے شادی کر لی اور ان کے بطن سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ ۱۹۶۹ء میں وہ ملازمت سے معطل اور ۱۹۷۰ء میں برطرف کر دیے گئے۔ ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو کراچی میں مصطفےٰ زیدی کی موت کا سانحہ رونما ہوا۔ ان کی موت کے اسباب و علل پر مباحث تو ہوئے لیکن یہ معمہ ہنوز حل طلب ہے۔

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

مصطفےٰ زیدی ایک فطری شاعر تھے۔ انہوں نے عمر بھر شعر و ادب سے تمسک رکھا۔ ان کے درج ذیل شعری مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو کر صاحبانِ دانش سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

(۱) زنجیریں (۱۹۳۹ء)

(۲) روشنی (۱۹۵۰ء)

(۳) شہر آزر (۱۹۵۸ء)

(۴) موج مری صدف صدف (۱۹۶۰ء)

(۵) گریبان (۱۹۶۴ء)

(۶) قبائے ساز (۱۹۶۷ء)

(۷) کوہ ندا

(۸) کلیات مصطفےٰ زیدی

اسکے علاوہ مختلف احباب نے ان کے کلام کے انتخاب بھی شائع کیے ہیں۔

تقسیم برصغیر کے بعد پاکستان میں جن شاعروں نے بہت جلد شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں ممتاز مقام حاصل کیا ان میں مصطفٰے زیدی کا نام بے حد اہم ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز تیغ الٰہ آبادی کے نام سے کیا اور اپنے جذباتی اور رومانی طرزِ احساس، کاٹ دار لہجے اور بلند آہنگی کے باعث بہت جلد شہرت حاصل کرلی۔

قدر فرما تیغ کی، اے دخترِ گنگ و جمن
تیغ جو اس وقت ہے پیغمبرِ شعر و سخن

پیغمبرِ شعروسخن تیغ الٰہ آبادی اسم بامسمّٰی ثابت ہوئے۔ انہوں نے میدانِ سخن میں اپنی تیغ زبان سے وہ کارہائے نمایاں کیے کہ ان کی کاٹ دار شعری آواز آج صاحبانِ فہم وفراست کے دلوں کو متاثر کررہی ہے۔ پاکستان آکر انہوں نے تیغ نیام میں رکھ لی اور مصطفٰے زیدی کے نام سے زباں زدِ خاص وعام ہوئے۔ انہوں نے اپنے سحر آفریں تخیل اور عمیق ادراک کی بدولت نوجوانوں اور سنجیدہ فکر قارئین کو بیک وقت متاثر کیا۔ ایک ایسے دور میں جب شاعری کی شمع کی لو مدہم ہورہی تھی اور احتساب کے نام پر فکروفن کو رسوا کیا جارہا تھا مصطفٰے زیدی نے اپنے شعری افکار کے ذریعے قلم کی حرمت کی پاسداری کی اور اپنے خونِ جگر سے اس بجھتی ہوئی شعری شمع کو اور فروزاں کردیا۔

تائب تھے احتساب سے جب سارے بادہ کش
مجھ کو یہ افتخار کہ میں مے کدے میں تھا

مصطفٰے زیدی جوش ملیح آبادی کے پرستار بلکہ عاشق زار تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں ان کی بلند آہنگی اور جوش وولولے کو جگہ دی۔ اس طرح ان کی شاعری میں بغاوت اور انقلاب کے رنگ ہویدا ہوئے۔ آپ ان کے مجموعے کوہِ ندا کی نظمیں مثلاً کس وقت اُجالا پھیلے گا، کوہِ ندا، اے تیغ کے غمخوارو، احتساب وغیرہ دیکھیے اور ان میں موجود ترشی

ملاحظہ فرمایئے۔ اسی طرح آپ قبائے ساز کی نظمیں زخم سفر، سودا، ہم لوگ، فرار، اے دور گور پرور اور لائجل وغیرہ کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ ان منظومات میں جوش ملیح آبادی کے موضوعات و اسالیب کی جھلک دکھائی دیتی ہے یا نہیں۔ دراصل مصطفےٰ زیدی نے جس عہد میں آنکھ کھولی انگریزوں کا ظلم و تمرد عروج پر تھا۔ آزادی کی تحریکیں اپنے منطقی انجام تک پہنچ رہی تھیں۔ بے زبانوں کو زبان مل گئی تھی اور شعر و سخن میں احتجاجی لب و لہجہ فروغ پا رہا تھا۔ مصطفےٰ زیدی نے بھی جوش کی تاسی میں انقلابی لہجہ اختیار کیا اور اپنی شاعری کو آزادی کا نغمہ بنا دیا۔

ساری دنیا میں گھنی رات کا سناٹا تھا
صحنِ زنداں میں ملے صبح کے آثار مجھے

مصطفےٰ زیدی کی مجموعی شاعری اور خصوصاً نظموں میں انسان کی آزادی، حق و انصاف کی علم برداری، مساوات، اعلیٰ اخلاقی اقدار کی بازیافت، نیکی، فطرت سے رغبت اور سچائی کی حکمرانی کا عزم ملتا ہے۔

زمیں کے کرب میں شامل ہوا ہوں راہ رَوو
دلِ شکستہ کی سوغات لے کے آیا ہوں
نظر میں عصرِ جواں کی بغاوتوں کا غرور
جگر میں سوزِ روایات لے کے آیا ہوں
جہانِ تیرہ کی خاموشیوں کے حلقے میں
چراغِ حرف و حکایات لے کے آیا ہوں
بلند و پست سے کہدو کہ صف میں آ جائیں
زمیں پہ ذوقِ مساوات لے کے آیا ہوں

مصطفےٰ زیدی کی شاعری اور خصوصاً غزلوں میں ایک رومانوی فضا غالب ہے۔ یہ رومانوی طرزِ احساس دراصل ان کی شاعری میں فیض احمد فیض سے ان کی والہانہ محبت کا

نتیجہ ہے۔ مصطفیٰ زیدی فیض سے بے حد متاثر تھے اور خاص طور پر فیض کی رومانی اور انقلابی شاعری ان کے لیے مشعلِ راہ تھی۔ فیض بھی مصطفیٰ زیدی کو "صاحب طرز" شاعر سمجھتے تھے اور انہیں ہم عصروں میں ممیز قرار دیتے تھے۔ مصطفیٰ زیدی کی غزلوں میں ایک خاص طرح کا جمالیاتی حُسن ہے جو ان کی ذات سے پھوٹتا ہے۔ ان کی پوری زندگی نا آسودگی اور انتشار کا شکار رہی۔ انہوں نے اپنے ذاتی کرب کو چھپانے کے لیے شاعری کا سہارا لیا وہ اپنی نظم "تخلیق" میں اپنے تخلیقی کرب کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کتنے جاں سوز مراحل سے گزر کر دل نے
کس قدر پیچ و خم و سُود و زیاں دیکھے ہیں
کتنے گرداب نظر آئے ہیں دَف کے نزدیک
کتنے بھونچال سرِ آبِ رواں دیکھے ہیں
گونجتے ساز، برستے ہُوئے نغموں کے قریب
دل کو تھامے ہُوئے اربابِ مغاں دیکھے ہیں
ڈوبنے والوں کے ہمراہ بھنور میں رہ کر
لبِ ساحل کے ضیا بار مکاں دیکھے ہیں
جام کے رنگ میں پائی ہے لہُو کی سُرخی
کاہ کے دوش پہ سو کوہِ گراں دیکھے ہیں
مُدتوں اپنے دلِ زار کا ماتم کر کے
خُود سے بڑھ کر بھی کئی سوختہ جاں دیکھے ہیں
سنسناتے ہُوئے ذرات کے رُخساروں پر
تُند سورج کے طمانچوں کے نشاں دیکھے ہیں
موت کو جن کے تصور سے پسینہ آ جائے
سینۂ زیست میں وہ زخمِ نہاں دیکھے ہیں

تب کہیں جا کے اِن اشعار کے گہوارے میں
اِک بصیرت کے ہُمکنے کے نشاں دیکھے ہیں

مصطفٰے زیدی کی شاعری میں رومانوی شاعری کے مختلف اور متنوع مظاہر نظر آتے ہیں۔ان کے ہاں ہجر و وصال کے قصے بھی ہیں اور روٹھے ہوئے محبوب کو منانے کے لیے التجائیں بھی۔تاہم ان کی بلند آہنگی اور جوش و جذبے میں کہیں کمی واقع نہیں ہوتی۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

کیا کیا نظر کو شوقِ ہوس دیکھنے میں تھا
دیکھا تو ہر جمال اسی آئینے میں تھا

....

ہم انجمن میں سب کی طرف دیکھتے رہے
اپنی طرح سے کوئی اکیلا نہیں ملا

....

روکتا ہے غمِ اظہار سے پندار مجھے
میرے اشکوں سے چھپا لے مرے رُخسار مجھے

....

دردِ دل بھی غمِ دوراں کے برابر سے اُٹھا
آگ صحرا میں لگی اور دھواں گھر سے اُٹھا

....

کوئی تو غم گسار تھا کوئی تو دوست تھا
اب کس کے پاس جائیں کہ ویرانہ چھُپ گیا

....

قدم قدم پہ تمنائے التفات تو دیکھ
زوالِ عشق میں سوداگروں کا ہات تو دیکھ

بس ایک ہم تھے جو تھوڑا سا سر اُٹھا کے چلے
اسی روش پہ رقیبوں کے واقعات تو دیکھ

....

کوئی رفیق بہم ہی نہ ہو تو کیا کیجیے
کبھی کبھی ترا غم ہی نہ ہو تو کیا کیجیے

اسی طرح مصطفےٰ زیدی کی نظموں میں بھی اظہارِ محبت کی بے شمار کیفیتیں جلوہ گر ہیں۔ وہ اپنے محبوب کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے بیٹھے ہیں۔ ان کی شاعری میں بوالہوسی اور عامیانہ پن عنقا ہے اور اس کا بنیادی سبب ان کی شاعری میں موجود وہ تہذیبی رچاؤ ہے جو انہیں ورثے اور روایات سے ملا ہے۔ آپ ان کی محض ایک نظم فرہاد کا مطالعہ فرما لیجیے اور دیکھیے کہ وہ محبت میں کس شعار کو فروغ دے رہے ہیں۔

اُس سے ملنا تو اِس طرح کہنا:۔

تجھ سے پہلے مری نگاہوں میں
کوئی رُوپ اس طرح نہ اُترا تھا
تجھ سے آباد ہے خرابۂ دل
ورنہ مَیں کس قدر اکیلا تھا

تیرے ہونٹوں پہ کوہسار کی اوس
تیرے چہرے پہ دھوپ کا جادو
تیری سانسوں کی تھرتھراہٹ میں
کونپلوں کے کنوار کی خوشبو
وہ کہے گی کہ اِن خطابوں سے
اورکس کس پہ جال ڈالے ہیں

تو یہ کہتا کہ پیشِ ساغرِ جم
سب مٹیوں کے پیالے ہیں

ایسا کرنا کہ احتیاط کے ساتھ
اس کے ہاتھوں سے ہات ٹکراتا
اور ا ہو سکے تو آنکھوں میں
صرف دو چار اشک بھر لاتا

عشق میں اے مُبصرینِ کرام
یہی تکنیک کام آتی ہے
اور یہی لے کے ڈوب جاتی ہے

مصطفےٰ زیدی کی شاعری میں ان کی ذات کا کرب ہویدا ہے۔ انہیں اپنے بے حس معاشرے میں جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا اس کا ذکر 'موج مرا' کے دیباچے میں رقم ہے۔ انہوں نے کند ذہنوں اور بوالہوسوں کے درمیان زندگی بسر کی اور اپنی شاعری کو اظہارِ ذات کا وسیلہ بنایا۔ انہوں نے اپنے جگر کے زخم کو شعری پیرائے میں عوام الناس کے سامنے پیش کر دیا۔

وہ چارہ گر بھی اسے دیر تک نہ پہچانا
جگر کا زخم تھا نغموں میں ڈھل گیا میرے

اسی بات کو یوں کہہ لیجیے کہ مصطفےٰ زیدی کی شاعری دراصل ان کی اپنے دل سے بے لاگ گفتگو ہے۔ اسی لیے اس میں غمِ دوراں کی شکایات بھی ہیں اور غمِ جاناں کی مشکلات کا ذکر بھی۔

ہزار شعر کہے یوں تو کہنے والوں نے
کسی کسی نے دلِ مبتلا سے باتیں کیں

مصطفےٰ زیدی کی زندگی بظاہر خوش و خرم گزری۔ وہ بے شمار عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز رہے لیکن عمر بھر ان کا دل بجھا بجھا رہا اور وہ حالات کی یورش کا شکار رہے۔ ان کی مسکراہٹ میں ایک اندوہ تھا جو صاحبانِ فہم و ذکا سے پوشیدہ نہ تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

مری روح کی حقیقت، مرے آنسوؤں سے پوچھو
مری تہقہوں کی دنیا مری ترجماں نہیں ہے

مصطفےٰ زیدی کی بے قرار و بے چین روح کو قرار اسی وقت نصیب ہوا جب وہ اس دار المحن سے نجات حاصل کر کے راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔

اب جی درودِ سود و زیاں سے گزر گیا
اچھا وہی رہا جو جوانی میں مر گیا

آپ مصطفےٰ زیدی کی مختلف ذائقوں کی حامل صرف تین غزلیں ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ ان میں موضوعات و اسالیب کے کیا کیا سامان یکجا ہو گئے ہیں۔

(۱)

اِس قدر اب غمِ دوراں کی فراوانی ہے
تُو بھی منجملۂ اسبابِ پریشانی ہے
مُجھ کو اِس شہر سے کچھ دُور ٹھہر جانے دو
میرے ہمراہ مِری بے سروسامانی ہے
آنکھ جھک جاتی ہے جب بندِ قبا کھلتے ہیں
تجھ میں اُٹھتے ہوئے خورشید کی عریانی ہے
اِک ترا لمحۂ اقرار نہیں مر سکتا
اَور ہر لمحہ زمانے کی طرح فانی ہے

کوچۂ دوست سے آگے ہے بہت دشتِ جنوں
عشق والوں نے ابھی خاک کہاں چھانی ہے
اس طرح ہوش گنوانا بھی کوئی بات نہیں
اور یُوں ہوش سے رہنے میں بھی نادانی ہے

(۲)

جس دن سے اپنا طرزِ فقیرانہ چُھٹ گیا
شاہی تو مل گئی دلِ شاہانہ چُھٹ گیا
کوئی تو غم گسار تھا کوئی تو دوست تھا
اب کس کے پاس جائیں کہ ویرانہ چُھٹ گیا
دُنیا تمام چُھٹ گئی پیمانے کے لئے
وہ مے کدے میں آئے تو پیمانہ چُھٹ گیا
کیا تیز پا تھے دن کی تمازت کے قافلے
ہاتوں سے رشتۂ شب افسانہ چُھٹ گیا
اِک دن حساب ہو گا کہ دُنیا کے واسطے
کن صاحبوں کا مسلکِ رندانہ چُھٹ گیا

(۳)

نہاں ہے سب سے بڑا دردِ سینۂ بیتاب
سوائے دیدۂ بے خوابِ انجم و مہ تاب
تمھیں تو خیر مرے غم کدے سے جانا تھا
کہاں گئیں مری نیندیں کدھر گئے مرے خواب

سفینہ ڈوب گیا لیکن اس وقار کے ساتھ
کہ سر اُٹھا نہ سکا پھر کہیں کوئی گرداب
عجیب بارشِ نیساں ہوئی ہے اب کی برس
صدف صدف شبِ وعدہ ہے اور گہر کم یاب
حُدود مے کدہ و مدرسہ گرا نہ سکے
یہ محرمانِ کلیسا یہ عارفانِ کتاب
وہاں بھی بزمِ خرد میں ہزار پابندی
یہاں بھی محفلِ رنداں میں سیکڑوں آداب
مَیں تشنہ کامِ غمِ آگہی کہاں جاؤں
اِدھر شعور کا صحرا اُدھر نظر کا سراب
تُو اپنے جلوۂ عُریاں سے شرمسار نہ ہو
یہی تمامِ نظارہ یہی کمالِ حجاب

مصطفےٰ زیدی کی شاعری میں فکر و فلسفہ کی ایک لہر بھی جاری و ساری ہے اور یقیناً یہ فراق گورکھپوری کا عطیہ ہے۔ مصطفےٰ زیدی نے کچھ عرصہ فراق سے اصلاح بھی لی اور ان کے شعری و فکری مشوروں پر عمل بھی کیا۔ فراق کی شاعری کا سب سے بڑا وصف ہی یہ ہے کہ اس میں ایمائیت ملتی ہے اور وہ قاری کو چند ساعتوں کے لیے اپنے سحر میں گرفتار کر لیتی ہے۔ مصطفےٰ زیدی نے اپنی غزلوں اور نظموں میں سوچ اور فکر کے نئے نئے در وا کیے ہیں۔ آپ ان کی غزلوں کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ ان میں تفکر کی پرچھائیاں پڑ رہی ہیں یا نہیں۔

ساری سڑکوں پہ اجارہ ہے ہنر مندوں کا
موڑ پر عشق کی چھوٹی سی دکاں آج بھی ہے

....

شہر کے کوچہ و بازار میں سناٹا ہے
آج کیا سانحہ گزرا ہے خبر تو لاؤ

....

ہم انجمن میں سب کی طرف دیکھتے رہے
اپنی طرح سے کوئی اکیلا نہیں ملا

....

انہی پتھروں پہ چل کے اگر آ سکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

....

ریت پر پھینک گئی عقل کی گستاخ لبی
پھر کبھی کشف و کرامات کا دریا نہ کھلا

....

دیکھ اے دشت جنوں بھید نہ کھلنے پائے
ڈھونڈنے آئے ہیں گھر کے در و دیوار مجھے

....

میں تشنہ کام غم آگہی کہاں جاؤں
اِدھر شعور کا صحرا، اُدھر نظر کا سراب

....

زمانے بھر کی کیفیت سمٹ آئے گی ساغر میں
پیو ان انکھڑیوں کے نام پر آہستہ آہستہ

....

تمہیں تو خیر مرے میکدے سے جانا تھا
کہاں گئیں مری نیندیں کدھر گئے مرے خواب

....

صہبائے تند و تیز کی حدت کو کیا خبر
شیشے سے پوچھئے جو مزا ٹوٹنے میں تھا

مصطفےٰ زیدی کی شاعری میں یہ گہرائی اور گیرائی کا ایک بڑا سبب ان کا وسیع المطالعہ ہونا بھی ہے۔ انہوں نے ہم عصر ادب کا عمیق مطالعہ کیا تھا اور اسے اپنی شاعری میں برتنے کی بھرپور کاوش بھی کی تھی۔ انہوں نے مغربی ادب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد یورپی ادب کو اچھی طرح سے پڑھا اور اپنے شعور کی پرورش و پرداخت میں اسے شامل کیا۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری اور خصوصاً اپنی نظموں میں مغربی تہذیب و ثقافت کے مختلف رُخوں پر روشنی بھی ڈالی ہے۔

مصطفےٰ زیدی ایک صاحب طرز شاعر تھے اور اسی باعث وہ فیض احمد فیض کی چشم معتبر میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ان کا اسلوب شعر ہم عصر شعرا سے جدا اور یگانہ تھا۔ وہ جوش ملیح آبادی کے اسلوب شعر پر دل و جان سے فریفتہ تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری کا لہجہ بلند آہنگ ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شدت جذبات سے مغلوب ہو کر خطبہ دے رہا ہے۔ مصطفےٰ زیدی کا یہ خطیبانہ رنگ ان کے عہد رفتہ کی بھی دین ہے۔ ایک ایسے دور میں جہاں نظریے بلند آہنگ نعروں میں تبدیل ہو رہے ہوں وہاں اسی مزاج کے اسلوب کے پیدا ہونے کی توقع ہوتی ہے۔ آپ ان کی نظم ''زخم سفر'' کے صرف تین بند ملاحظہ فرمایئے اور اس کی بلند آہنگی اور ہمہمہ محسوس کیجیے۔

شہو قلم کے مُہمات جاننے والو
دلِ حیات کے ضربات جاننے والو
مزاج ارض و سماوات جاننے والو
ادب کے جملہ مقامات جاننے والو

تمھیں نہ صرف شبستاں میں جا کے لکھنا ہے
ہر ایک عہد کے زنداں میں جا کے لکھنا ہے

پلک ہی ایک حقیقت نہیں کمان بھی ہے
زمین بھی ہے، فضا بھی ہے، آسمان بھی ہے
جو کاٹ دی ہے حکومت نے وہ زبان بھی ہے
حکومتوں پہ جو گذری وہ داستان بھی ہے

عتاب و لطف و سزا و جزا کا قصہ ہے
رقم کرو کہ یہ قصہ وفا کا قصہ ہے

لکھو کہ تاجِ شاہی نہیں مزاجِ عوام
شکست کھا کے رہے گی چراغ سے ہر شام
ہر ایک عہد میں ہوں گے ہزار گل اندام
ہر ایک عہد میں آئے گا عشق پر الزام

جہاں بھی مطلعِ حق پر سحاب اٹھے گا
کسی قلم سے کوئی آفتاب اٹھے گا

مصطفےٰ زیدی الٰہ آباد میں پیدا ہوئے اور زبان و بیان پر مہارت حاصل کی۔ وہ لفظ شناس تھے اور انہیں بہ خوبی علم تھا کہ کس لفظ کو کہاں استعمال کرنا ہے۔ وہ فصاحت کے بادشاہ اور بلاغت کے تاجور تھے۔ وہ لفظوں سے طوطا مینا بنانے کا ہنر جانتے تھے۔ آپ ان کی غزلوں اور نظموں کا اسلوبیاتی مطالعہ فرمالیجیے۔ آپ خود دیکھیں گے کہ ہر لفظ اپنے پورے سیاق و سباق سے استعمال ہوا ہے۔ وہ الفاظ سے ماحول بھی تخلیق کرتے ہیں اور صورت حال بھی۔ ان کے لفظوں سے مناظر بھی جنم لیتے ہیں اور محاکات بھی۔ آپ ان کی صرف ایک نظم ''کارواں'' کا مطالعہ فرمائیے اور درج بالا تمام محاسن اس میں موجزن دیکھیے۔

اسی طرف سے زمانے کے قافلے گزرے
شکوتِ شامِ غریباں کے خلفشار میں گم

ذرا سا راگ خموشی کے دوش پر لرزاں
ذرا سی بوند پُر اسرار آبشار میں گم
گھنے اندھیرے میں گمنام راہ رَو کی طرح
کوئی چراغ چمکتی ہوئی قطار میں گم
فضا میں سوئی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں
ستارے نیل کی خاموش جوئبار میں گم
شگفتہ، پیار کی شدت سے کانپتے ہوئے ہونٹ
کسی کی وعدہ وفائی کے اعتبار میں گم
نہ جانے کتنی اُمیدیں اُفق سے آنکھ لگائے
سحر کی آس میں فردا کے انتظار میں گم

مصطفےٰ زیدی کی شاعری میں خوبصورت تراکیب و مرکبات کا استعمال ہوا ہے۔ آپ درج ذیل تراکیب و مرکبات کا مطالعہ فرمایئے اور مصطفےٰ زیدی کے حسن تخلیق اور شعری اسلوب کی داد دیجیے۔

محرمِ اسرار، خلوتِ ذہن، نرمیِ رمز و کنایہ، پرتوِ شاخ، ساعتِ دیدار، راہِ مغیلاں، لرزشِ مژگاں، جشنِ عروسی، شامِ بادہ خوار، شبِ مقتل، حریمِ حسن، شمعِ مبیں، زمزمۂ دل نواز، طوقِ زماں و مکاں، ردائے زر، عہدِ گرز، عصرِ موسیائی، مزاجِ جفاکشی، طلسمِ قضا و قدر، راہِ کائنات، تاجرانِ جشنِ طرب، مجاہداتِ فریب آفریں، بتانِ ہیکلِ اوہام، عبائے اطلس و تاجِ زری، خمِ شکستۂ تاج و نگیں، مکاشفاتِ بزرگانِ دیں، مزاجِ ارض و سماوات، گوہرِ نادیدہ، تہذیبِ نظر، نکہتِ بے بصراں، شوقِ ہوس، دریائے رنگ و نور، طوقِ فردِ جرم، موجِ خونِ خلق، صہبائے تند و تیز، یورشِ آداب، حلقۂ بدنام، خلوتِ گمنام، بے مائگیِ ذہن، فہم و فراست، گنبدِ آفاق، سنگِ سبک مایہ، توصیفِ شبِ ہجر، نگارِ ساحلِ مغرب، جادۂ گم

گشتہ، پسِ پردۂ شب، تاریخ ساعتِ امروز، چشمِ مشتاق، صفحہ صحرا، راندۂ موج، دروازۂ دوراں، طالبِ دست ہوس، صف احباب گریزاں، ارواحِ زشت، عرفہ ومحراب، طرزِ فقیرانہ، مسلکِ رندانہ، پندارِ نظر، محرومِ گداز، روحِ شبِ تار، رواجِ نقشِ قدم، عہدِ طرب، عصمتِ حرف وحکمت، خمارِ آخر شب، خطیبانِ بزمِ صفا، مرگِ انبوہ مریضۂ افکار، تہذیبِ تمنا، چشمِ مشتاق، طاقِ کہنہ، طلسمِ لب وسحر امکاں، شہرِ طلسمات، سرسموم وصبا، ہمدمِ دیرینہ، رفیقانِ سحر، رقاصۂ طناز، سطحِ خوش آواز، پسِ پردۂ دل، توصیفِ شبِ ہجر، تہذیبِ تمنا، متاعِ الفاظ، طرزِ دلبری، شہرِ حوادث، صعوبتِ قفس، قتیلِ زمزمۂ وصل، دخترِ صحرا، رفیقِ جنوں، کشمکشِ ذہن، ساعت، مرہم، نگاہِ پیرِ مغاں، طلوعِ عقلِ خاور، خرابۂ دل، مبصرین کرام، کوندا، اندووفا، عشرتِ غم، سجدہ گاہِ قدسیان، انبوہِ عظیم، رمیرِ غم کون ومکاں۔

مصطفےٰ زیدی نے اپنی شاعری میں صنائع لفظی ومعنوی کا استعمال بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ خاص طور پر صنعت تضاد اور صنعت مراعاۃ النظیر کا استعمال بکثرت ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ مصطفےٰ زیدی نے کتنی مہارت سے صنعتیں استعمال کی ہیں۔

بلند و پست سے کہدو کہ صف میں آ جائیں
زمیں پہ ذوقِ مساوات لے کے آیا ہوں

(صنعت تضاد)

طالبِ دستِ ہوس اور کئی دامن تھے
ہم سے ملتا جو نہ یوسف کے گریباں سے ملا

(صنعت تلمیح)

وہ زخم جس کو کیا نوکِ آفتاب سے چاک
اسی کو سوزنِ مہتاب سے رفو کرتے

(صنعت مراعاۃ النظیر)

مصطفےٰ زیدی نے علم بیان کے تمام نمایاں اراکین کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ خاص طور تشبیہات و استعارات کے استعمال پر انہیں بے پناہ قدرت حاصل رہی ہے۔ اسی طرح انہوں نے مجاز مرسل کے مختلف اراکین کو بھی انتہائی سلیقے سے استعمال کیا ہے۔ مصطفےٰ زیدی روزمرہ اور محاورہ کے استعمال پر بے پناہ قدرت رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں اہلِ زبان کی فنی وفکری پختگی ہویدا ہے۔ روزمرہ اور محاورہ کے حوالے سے صرف دو اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

سفینہ ڈوب گیا لیکن اس وقار کے ساتھ
کہ سر اُٹھا نہ سکا پھر کہیں کوئی مہتاب

....

اپنا غم نہ اسکا غم ڈوبتی ہوئی لو کو فکر ہے تو اس کی ہے
دربدر نہ رسوا ہو حسرتوں کا افسانہ کو بہ کو نہ رہ جائے

اس کے ساتھ ساتھ مصطفےٰ زیدی کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے اپنی نظموں میں بطور خاص بے شمار انگریزی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان کے شعری مجموعے ''موج مری صدف صدف'' میں مختلف زبانوں کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ شاعرانہ معیار میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ آپ انصاف سے بتایئے کہ ہمارے کس شاعر نے بکنگھم، ٹاؤنسنڈ، اسٹیکل، فرائڈ، میٹ گیلری، کیو گارڈن، ٹیمز، ایسٹ انڈ، ناور، ایسٹ انڈ فنچلے، جیمز پارک، ہیملٹ، اسٹیج اولڈ وک، فانٹس، اسپٹنک، ملر، پرومناڈ، ہیل کاسل، بیومانٹ، ورڈسورتھ، ویگنر ڈووژ، کیوپڈ، اولمپس، وینس، پارتھینان، ایتھنز، سویز، ویلز، فلیٹ، کاریڈر جیسے الفاظ صحیح سیاق وسباق کے ساتھ اپنی شاعری میں استعمال کیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مصطفےٰ زیدی کا اسلوب ان کی کجکلاہ شخصیت سے متصل ہے۔ وہ ایک عالی اور بلند مرتبت شخصیت کے مالک تھے اور اسی باعث ان کے اسلوب میں بھی ایک طنطنہ اور وقار ملتا ہے۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ عظیم شاعری ارفع جذبات اور پُروقار زبان سے معرضِ وجود میں آتی ہے۔ مصطفےٰ زیدی کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بسیط افکار و جذبات کو خوبصورت، دلنشیں اور پُراثر اسلوب میں پیش کر کے اپنی شاعری کو دوامی عناصر سے مالا مال کر لیا ہے۔ انہوں نے جوش ملیح آبادی کی بلند آہنگی، ولولے اور گھن گھرج فیض احمد فیض کی رومانویت اور بغاوت اور فراق گورکھپوری کی فلسفیانہ فکر اور رمزیت و ایمائیت اپنی شاعری میں جذب کرنے کی شعوری کاوش کی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصطفےٰ زیدی کی شاعری جوش، فیض اور فراق کے شاعرانہ محاسن کا پُرتجمل اظہار ہے۔ مصطفےٰ زیدی عصرِ حاضر کے دانش وروں اور ہنرمندوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ ۔

چلو افلاک کے زینوں پہ چڑھ کر عرش تک پہنچیں
کہ سیّد مصطفےٰ زیدی اسی منزل میں رہتے ہیں

◆◆◆

◆◆◆

لکھنوی تہذیب کا آخری چراغ۔ سیّد آل رضا

◆◆

بیسویں صدی میں پورے برصغیر کا جوہر سمٹ کر لکھنؤ میں جمع ہو گیا تھا۔ پورا لکھنؤ علم و ادب کی کہکشاں بن گیا تھا اور ہر مزاج اور مذاق کے اصحاب اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کوشاں تھے۔ یہی سبب ہے کہ اس عہد کے لکھنؤ میں آپ کو اصناف نظم و نثر کے اعلیٰ تر تخلیق کاروں کا ایک جمِ غفیر نظر آئے گا اور ان کی تخلیقات میں ہزار سالہ ہند مسلم تہذیب و ثقافت کے اثرات جلوہ فگن دکھائی دیں گے۔ اگر اس صورت حال کا عمیق نگاہی سے تجزیہ کیجیے تو آپ کو علم ہو جائے گا کہ لکھنؤ والے ہمیشہ جدت پسند رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ نثر اور نظم میں اہم ترین ادبی تحریکات کا مرکز و محور بھی لکھنؤ ہی رہا ہے۔ لکھنؤ کی شعری روایات کو مستحکم کرنے والے شعرا میں ایک **سید آل رضا** بھی ہیں، جنھوں نے نصف صدی تک مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور اُردو ادب میں اپنے لیے ایک مستقل اور معتبر جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

چراغ کتنے نذر تھے شب جوانی کے
ہوا کے رُخ پہ جلے اور رات بھر ٹھہرے

سید آل رضا لکھنوی ۱۰ جون ۱۸۹۶ء کو نیوتنی نامی قصبہ ضلع اُناؤ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اسی مناسبت سے رضا لکھنوی کے نام سے زبان زد عام ہوئے۔ آپ

کے والد ماجد خان بہادر جسٹس سید محمد رضا لکھنؤ چیف کورٹ کے جج کی حیثیت میں اپنے فرائض ادا کرتے رہے۔ آل رضا نوعمری میں اپنے والد ماجد کے ہمراہ رہے اور اسی سبب سے ضلع نوردی مشغلہ ٹھہرا۔ ابتدائی تعلیم سیتاپور سکول سے مکمل کی۔ کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے اور میو سینٹرل کالج الٰہ آباد سے ایل ایل بی کی ڈگری امتیازی حیثیت میں حاصل کر کے وکالت شروع کر دی۔ تقسیم برصغیر کے بعد آپ اپنے دوست شعرا کی محبتوں اور اہلِ قلم دوستوں کی شفقتوں کو خیر آباد کہہ کر اپنے حقیقی بھائیوں ہاشم رضا، مسعود رضا اور کاظم رضا کے پرزور اصرار پر لکھنؤ سے کراچی تشریف لے آئے اور اسی عروس البلاد کو مستقل قیام گاہ کے طور پر قبول کر کے سکونت پذیر ہو گئے۔ کراچی میں آل رضا کو وہ ماحول نہ مل سکا جس کے وہ طلب گار تھے لہٰذا وہ زیر لب کہا کرتے تھے۔

یوں تو بیتابی میں اس محفل سے اُٹھ آنا پڑا
کیا کہیں پھر کیا ہوا جب دل کو سمجھانا پڑا
موت ہی جس کو چھڑا سکتی تھی وہ دل کش دیار
یوں چھٹا ہم سے کہ ہم کو خود ہی چھوڑ آنا پڑا

کراچی میں آل رضا نے وکالت کا پیشہ جاری رکھا اور شعر و ادب سے اپنے والہانہ تعلقِ خاطر کو برقرار رکھا۔ یہ بات انتہائی قابلِ تحسین ہے کہ آل رضا اور ان کے خانوادے نے عہدہ ہائے جلیلہ رکھنے کے باوجود پاکستان کو کبھی اپنی ''شکارگاہ'' نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ ''قربان گاہ'' سمجھا۔ پاکستان آ کر آل رضا کی وہ طبعی شگفتگی بہت حد تک کم ہو گئی تھی۔ کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد آخر کار وہ ۲۔ مارچ ۱۹۷۸ء کو ۸۲ برس کی عمر میں اس دارالمحن سے جنت الفردوس کی جانب کوچ کر گئے۔ ان کی رحلت پر ماہر القادری نے ارتجالاً یہ قطعہ پیش کیا۔

سانحہ غم ناک ہے کیا کیجیے
جرعہ جرعہ زہرِ غم کو پیجیے

حضرت آلِ رضا کی موت پر
لفظ اور معنی کو پرسا دیجیے

سید آل رضا ایک علمی و ادبی گھرانے کے چشم و چراغ تو ضرور تھے لیکن ادبی شغف رکھنے کے باوجود اس گھرانے میں کوئی شاعر پیدا نہیں ہوا تھا اور نہ کسی کے وہم و گمان میں تھا کہ آلِ رضا شاعر بن کر صنفِ غزل و مرثیہ کو اپنے افکارِ زرّیں سے مالا مال کر دیں گے۔ آلِ رضا وکالت کے سلسلے میں ''پرتاب گڑھ'' میں مقیم رہے اور یہیں سے انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ اس زمانے میں پورے ہندوستان میں آرزو لکھنوی کا شہرہ تھا اور ان کا کلام ادبی منڈیوں میں ٹکسالی سکے کی طرح چلتا تھا۔ آلِ رضا نے بھی خط و کتابت کے ذریعہ ان سے تلمذ حاصل کیا اور لکھنو منتقلی کے بعد یہ سلسلہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ آلِ رضا کی شعری صلاحیتوں کا اعتراف کرنے والوں میں علامہ اقبال، صفی لکھنوی، اثر لکھنوی، آرزو لکھنوی، نیاز فتح پوری، کرار حسین، فرمان فتح پوری، ممتاز حسین، مجتبیٰ حسین، وقار عظیم اور سید وحید الحسن ہاشمی قابلِ ذکر ہیں۔ آلِ رضا کے درج ذیل شعری مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر صاحبانِ فہم و ادراک سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں :

۱) نوائے رضا (غزلیں) ۱۹۳۹ء
۲) ''شہادت سے پہلے شہادت کے بعد'' (مرثیے) ۱۹۴۳ء
۳) غزل معلّے (غزلیں) ۱۹۵۹ء
۴) عظمتِ انسان (مرثیہ مع مضامین) مرتبہ: سید وحید الحسن ہاشمی ۱۹۶۷ء
۵) شریکۃ الحسین (مرثیہ مع مضامین) ۱۹۷۰ء
۶) مراثی رضا (مرثیے) مرتبہ: پروفیسر کرار حسین 1981ء
۷) باقیاتِ آلِ رضا (غیر مدون کلام کی تدوین) مرتبہ: ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ۲۰۰۰ء

لکھنؤ برصغیر میں ہزار سالہ ہند مسلم تہذیب و ثقافت کا سب سے بڑا

نمائندہ تھا اور آل رضا اس لکھنوی تہذیب کے پروردہ اور نمائندہ تھے۔ یہ تہذیب وضع داری، نفاست اور لطافت کے ساتھ ساتھ ہنرمندی اور سلیقہ شعاری بھی رکھتی تھی۔ آل رضا کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں یہ تمام محاسن یکجا ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں ضیاء الحسن موسوی کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے:

> ''سید آل رضا ہماری ثقافت کا چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ اس ثقافت کا، جو مسلم ہندوستان کی ثقافت ہے اور جس کے تحفظ کے لئے پاکستان بنانے کا عزم کیا گیا تھا۔ یہ نہ لکھنؤ کی ثقافت ہے اور نہ دلی کی، نہ لاہور کی نہ مٹیا برج کی اور نہ پٹنہ کی۔ اس کو کبھی شائستگی بھی کہتے تھے اور تہذیب بھی اور آج کل اس کی تلاش ثقافت کے عنوان سے ہو رہی ہے۔''

(ضیاالحسن موسوی 'غزل معلی سے کربلائے معلی تک' ماہنامہ 'سب رس' کراچی، دسمبر ۱۹۷۹ء ص ۲۱۵)

آل رضا ایک مرتب و مسلسل تہذیب کی کڑی تھے۔ ان کے آباؤ اجداد مشرقی تہذیب وثقافت پر جان چھڑکتے تھے۔ آپ کے والد سید محمد رضا وضع دار انسان تھے۔ آباؤ اجداد کی یہ وضع داری آل رضا کی شخصیت پر اثر انداز ہوئی اور انہوں نے تمام عمر اس وضع دارانہ تہذیب کو سینے سے لگائے رکھا۔

وضع خودداری نباہی تو مگر
اے رضاؔ دانتوں پسینہ آ گیا

آل رضا ایک خوش شکل اور وجیہہ پیکر انسان تھے۔ ان کے نقش و نگار، رنگ روپ اور قد وقامت میں دلکشی پائی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں جوش ملیح آبادی کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے:

> ''میری اور آل رضا کی ملاقات اس دور میں ہوئی جب کہ نام خدا ہم دونوں خوب رُو جوان تھے۔ ہم پر ایک ایسی آن برستی تھی کہ جو بھی دیکھتا

تھا بس دیکھے ہی جاتا تھا اور خصوصیت کے ساتھ آل رضا کا چہرہ تو اس قدر تابناک اور سراپا اس حد تک متناسب و نازک تھا کہ اللہ کی پناہ!"

(جوش ملیح آبادی 'ہائے آل رضا' مجلّہ 'یادِ آل رضا' کراچی، ہماری منزل، ۱۹۷۸، ص ۱۵)

آل رضا نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزارا تھا۔ یہی سبب ہے کہ پاکستان تشریف لے آنے کے باوجود آخری عمر تک ان کے لکھنوی طرز بود و باش میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ بڑی نفاست اور نزاکت سے انگرکھا بھی پہنتے تھے اور ٹوپی و شیروانی بھی۔ جب وہ اس طرحدار شخصیت کے ساتھ مشاعروں میں شرکت فرماتے اور اپنے مخصوص انداز میں اشعار پڑھتے تو پورے پنڈال میں ایک سماں سا بندھ جاتا تھا۔ ایک مشاعرے کی روداد شوکت تھانوی کی زبانی سنیے :

"...... مشاعرے میں ایک دولہا میاں نظر آئے۔ مخمل کی پھولدار شیروانی، اس کپڑے کی کشتی نما ٹوپی، اس کپڑے کی دلائی، ریشمی موزے، چوڑی دار پاجامہ، ہاتھ میں ریشمی رومال، گورا چٹا رنگ، چال میں ایک خاص پامالی، اداؤں میں بلا کی عروسیت، گفتگو کرنے میں "الف دو زبر اَن، دو زیر اِن، دو پیش اُن" کی سی کیفیت۔ کلام پڑھنے میں ریشمی رومال اور ہاتھ کے انگوٹھے میں "اختو بختو" والا ربط اور شعر کے آخر تک پہنچتے پہنچتے چہرہ پر انتہائی کرب کے پورے آثار۔ معلوم ہوتا تھا کہ شاعر نے شعر نہیں پڑھا ہے اپنے کلیجے میں چبھا ہوا تیر بمشکل تمام نکالا ہے اور سامعین کے سامنے پھینک کر خود بے ہوش ہو گیا ہے۔ جی چاہا کہ ترس کھا کر شعر پڑھنے سے منع کر دیں۔ معلوم ہوا کہ آپ سید آل رضا ہیں۔ آخر شاعر کے علاوہ انسان کی حیثیت سے بھی آپ سے ملے۔ قریب سے آپ کو دیکھا محبت کرنے والا دل، گھل مل جانے والا اخلاق اور دل لبھا لینے والی ادائیں رکھتے ہیں۔"

(شوکت تھانوی 'شیش محل' طبع چہارم، لاہور، اردو بک سٹال، ۱۹۳۸ء، ص ۱۲۹)

آل رضا اگرچہ ایک سادہ منش، سنجیدہ، کم گو اور متین انسان تھے۔ تاہم ان کے مزاج میں شوخی اور ظرافت کے عناصر بھی موجود تھے۔ وہ نجی محفلوں میں دوستوں کے ہمراہ خوب ہنسی مذاق کیا کرتے اور احباب ان کی شیرینی گفتار کے مزے لیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں سید وحید الحسن ہاشمی رقم طراز ہیں:

''......مرحوم آل رضا بامعنی اور بامقصد مزاح کے قائل تھے۔ اکثر دلچسپ حکایات اور واقعات سناتے خود بھی ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے تھے۔ مزاح کا عنصر ان کی طبیعت ثانیہ بن گیا تھا۔ آدھی آدھی رات تک طنز و مزاح کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ ایک مولوی صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں چھ سال کا تھا۔ کتاب میں 'اشتہا' کا لفظ آ گیا۔ مولوی صاحب نے میری کمسنی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے معنی ''بھوک'' بتا دیا۔ میں نے یاد کر لیا۔ ایک دن میری طبیعت بھاری تھی۔ میں بغیر کھائے پئے سو گیا۔ نو بجے رات کو کسی عورت نے مجھے جگایا کہ اٹھو کھانا کھا لو۔ میں نے بغیر کسی تردد کے فوراً جواب دیا کہ اس وقت مجھے اشتہا نہیں ہے۔ اب سوچتا ہوں تو مولوی صاحب پر ہنسی آتی ہے۔

لاہور کے ایک مسن شاعر نے مرحوم سے کہا کہ آخر آپ مرثیوں میں گھوڑے اور تلوار کا ذکر کیوں نہیں کرتے جبکہ میر انیس اور دبیر نے ان کا تذکرہ کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ وہ دونوں حضرات فنون سپہ گری کے بھی استاد تھے اور گھوڑ سواری جانتے تھے۔ میں تو فقط شادی والے دن گھوڑے پر بیٹھا ہوں۔''

(سید وحید الحسن ہاشمی 'باتیں آل رضا کی' ہفت روزہ رضا کار لاہور، ۸۔ اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۲)

آل رضا ایک پاکباز اور بلند کردار مرد مومن تھے۔ ان کی پوری زندگی صالح

اعمال میں بسر ہوئی۔ وہ دینی اقدار کے فروغ کے لئے تمام عمر سرگرم عمل رہے۔ مذہب کے معاملے میں وہ بعض اصولوں کے پابند تھے اور بسا اوقات مذہبی اقدار پر ہر چیز کو قربان کر دیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں جوش ملیح آبادی رقم طراز ہیں:

''...... شعرا عموماً رنگین طبع، حسن پرست اور رند ہوتے ہیں مگر دوست آل رضا قطعی طور پر آنکھیں جھکائے رکھنے والے مرد متقی تھے۔ میرے دوست منور عباس صاحب ایڈووکیٹ کہا کرتے تھے کہ رضا صاحب اس بلا کے پرہیزگار ہیں کہ اگر کوئی کافر ادا آدھی رات کو ان کی خواب گاہ میں در آئے تو وہ اسے نہیں گھبرا کر استخارہ دیکھنے لگیں گے۔''

(جوش ملیح آبادی 'ہائے آل رضا' مجلّہ بیاد آل رضا' کراچی، ہماری منزل، ۱۹۷۸ء، ص ۱۵)

آل رضا ایک مخلص اور راست گفتار انسان تھے۔ ان کے دل میں ہمیشہ دوسروں کے لیے احترام رہتا تھا۔ ان کی یہ سادگی اور شرافت بعض اوقات ان کے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہوتی تھی مگر وہ یہ وتیرہ چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس سلسلے میں ایک کالم نگار اور پروڈیوسر نصر اللہ خاں رقم طراز ہیں:

''...... سید صاحب جسے ایک بار اپنا دوست سمجھ لیتے زندگی بھر اس کی خامیوں کے باوجود اس سے نبھانے کی کوشش کرتے۔ وہ بڑی آسانی سے اپنے دشمن نما دوستوں کی باتوں میں آجاتے اور غضب تو یہ ہے کہ وہ اس زمانے میں بھی یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان جھوٹ نہیں بول سکتا اور نہ اس سے دھوکے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے ہاتھوں بڑی آسانی سے دھوکہ کھا جاتے اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ بعض صورتوں میں تو وہ بڑے شوق سے دھوکے کو دھوکا سمجھ کر بھی کھایا کرتے تھے۔ ارم لکھنوی مرحوم کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے۔

ارتم مزاجِ محبت کو آزمائے جا
سمجھ سمجھ کے حقیقت، فریب کھائے جا

(نصر اللہ خاں "سید آل رضا مرحوم" روزنامہ حریت کراچی، ۸ مارچ ۱۹۷۸ء، ص ۷)

آل رضا ایک گمشدہ تہذیب کے نمائندے تھے لہٰذا ان کی شخصیت کے احاطہ کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کو اس مخصوص تہذیب و معاشرے کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھیں۔ جب تک اس تہذیب کے اثرات باقی رہیں گے آل رضا کی شخصیت بھی زندہ و تابندہ رہے گی۔ ہم آل رضا کی سیرت کے بارے میں اپنی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے شوکت تھانوی کے ہمنوا ہو کر کہہ سکتے ہیں:

"......اگر مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنی کتاب کا نام "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" نہ رکھا ہوتا تو میں آل رضا کو مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کہتا۔ صرف شکل و صورت ہی کے نہیں سیرت و طینت کے بھی حسین۔ چہرے پر خاندانی شرافت کا نور، مزاج میں تکلفاً نہیں بلکہ واقعی انکسار، شخصیت میں اس بلا کی جاذبیت کہ جو ایک مرتبہ ملا اس نے ہمیشہ دم بھرا۔ شائستگی اور نفاست کا معیاری پیکر۔" (۳۴)

(شوکت تھانوی "لکھنؤ کی چند ادبی شخصیتیں، ماہنامہ نقوش لاہور، ۱۹۵۵ء، ص ۵۳۷)

آل رضا نے لکھنؤ سے جو شعری سفر شروع کیا تھا وہ ۱۹۷۸ء میں کراچی میں اُن کی رحلت کے ساتھ تمام ہو گیا۔ لکھنوی تہذیب و ثقافت کا یہ بے مثال نمائندہ اپنے شعری افکار کا چراغ روشن کر کے اس دنیا سے تو رخصت ہو گیا لیکن اُس کی روشنی سے آج بھی پاکستانی شعر و ادب کے ایوان جگمگا رہے ہیں۔ بقول نفیس فتح پوری:

رگ رگ میں وہ رچی ہوئی تہذیبِ لکھنؤ
انداز گفتگو کا وہ صدق و صفا کے ساتھ
وہ آئینہ انیس و خلیق و دبیر کا
ہی ختم گیا آل رضا کے ساتھ

سیّد آل رضا کی شاعری اور خصوصاً غزل لکھنوی شعری روایت سے جڑی ہوئی ہے۔ زمانۂ حاضر میں روایت کا مفہوم جدید غزل گو شاعروں نے بہت کچھ بدل دیا ہے اور روایت کے لفظ کو بالعموم فرسودہ، کہنہ، مجہول اور از کار رفتہ کے معنوں میں استعمال کیا ہے، جب کہ روایت کا مفہوم مختلف بھی ہے اور وسیع بھی کہ روایت سماجی رسوم کی بہتر طریقے سے انجام دہی کی ایک صورت کا نام ہے۔ اسی لئے معروف مغربی نقاد ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے کہا ہے کہ جو لوگ اپنی روایات کی پاسداری نہیں کرتے اور عملاً ان سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں، وہ دراصل بے شعور، غیر مہذب، جنگلی اور وحشی ہو جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ روایات کسی ایک مخصوص وقت میں فوری تعمیر نہیں ہو جاتیں، بلکہ کسی مخصوص تہذیبی و تمدنی ماحول میں ان کا خمیر اٹھتا ہے اور بتدریج نمو پاتا رہتا ہے۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ یہ ایک مستقل صورت اختیار کرتی ہیں۔ اسی لئے معروف نفسیاتی نقاد ریاض احمد کا خیال ہے کہ ہر روایت کو اپنی جداگانہ حیثیت کو متعین کرنے کے لئے وقت درکار ہوتا ہے۔ اس لئے روایت کا تعلق ماضی سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ محمد حسن عسکری نے "رینے گینوں" کے حوالے سے روایات کا سلسلہ مابعد الطبیعیات سے جوڑا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ روایتی ادب اور روایتی فنون صرف روایتی معاشرے میں پیدا ہو سکتے ہیں اور روایتی معاشرہ وہ ہے جو مابعد الطبیعیات کی بنیاد پر قائم ہو۔ بہر حال یہ طے ہے کہ روایت ماضی کا اجتماعی شعور ہے، جس کے بغیر مستقبل کو بھی روشنی نہیں مل سکتی۔ اس مسئلے پر دورِ جدید کے اہم شاعر اور نقاد ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے تصورِ روایت کو دیکھا جائے تو روایت کے سلسلے میں بعض غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ اُردو کے شعری ادب کا المیہ یہ ہے کہ جو شعرا بدلتے ہوئے معاصر ادبی رجحان کا ساتھ دینے کی کوشش کرتے رہے یا جنہوں نے جدت کو فیشن کے طور پر اپنایا، ان کے کلام پر زیادہ توجہ دی گئی اور غزل کا کلاسیکی لب و لہجہ کسی قدر پس منظر میں چلا گیا۔ جن شاعروں نے روایت کے شعور کو زبان و بیان کی پختگی کے ساتھ پیش کیا، ان کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔

یقیناً نئے تجربات شاعری کے موضوعات اور اسالیب کے دوائر کو وسیع کرتے ہیں۔ ہر کامیاب تجربہ ماضی کے بارے میں ہمارے رویوں کو تبدیل کر سکتا ہے، لیکن اگر ہم ایک صنف کے مخصوص مزاج، اس کی روایتی قدر و قیمت اور اس کی تاریخی اہمیت کا خیال نہیں کریں گے تو فن کی بہت سی سمتیں نگاہ سے اوجھل ہو جائیں گی۔ اس پس منظر میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر شاعر کو اس کے خصوصی میلانات اور اس کے پیش رو شعراء سے مربوط کر کے دیکھا جائے۔ چنانچہ سید آل رضا کی غزل گوئی کا مقام متعین کرتے ہوئے غزل کے کلاسیکی لہجے کی اس روایت کو گرفت میں لینا چاہیے، جو لکھنؤ کی نمائندہ قدروں کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔

غزل ہماری زندگی کے تہذیبی، عمرانی اور جذباتی تقاضوں کو ہمیشہ سے پورا کرتی رہی ہے اور اسی وجہ سے زندگی کے ان تمام پہلوؤں کا اتار چڑھاؤ غزل میں نظر آتا ہے، جو ہماری زندگی میں عہد بہ عہد رونما ہوتے رہے۔ یہ تبدیلیاں غزل میں آپ کو جلوہ گر دکھائی دیں گی۔ غزل میں جہاں ایک طرف انفرادی معاملات کی ترجمانی ملتی ہے، وہاں دوسری جانب اجتماعی شعور کو بھی نہایت سلیقے سے پیش کیا گیا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ انفرادی رنگ کو بھی آفاقی روپ دے دیا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے مزاج میں غزل کی صنف اس طرح رچ بس گئی ہے کہ اب اس کو ادب اور زندگی سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں رہا۔

۱۸۵۷ء کے خونیں واقعات نے دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کی رقابت اور معاصرانہ چشمک پر شدید ضرب لگائی۔ اب ان دونوں روایتوں کے ملاپ سے ایک تیسری اور نئی روایت معرضِ وجود میں آئی۔ اس تازہ روایت کا سب سے اہم اور منفرد پہلو یہ تھا کہ اس میں نئی زندگی کے تقاضوں کو سمجھنے، پرکھنے اور جرأت سے پیش کرنے کا حوصلہ تھا۔ اس طرح غزل کا وہ ایمائی لب ولہجہ اپنی مخصوص افادیت کھونے لگا اور تشبیہات و استعارات اور علامات میں انفرادیت کی ضرورت پر زور دیا جانے لگا۔

۱۹۱۴ء سے قبل کی جدید نظموں پر حالی کا اثر تھا اور غزلوں پر داغ اور امیر کا رنگ غالب رہا۔ مگر اہم بات یہ تھی کہ غزل کی دنیا میں ایک حیرت انگیز مگر پر سکون انقلاب خاموشی سے برپا ہو رہا تھا۔ لکھنؤ میں اس دور میں خاص طور پر غالب اور میر کی طرز شاعری کو اہمیت دی جا رہی تھی اور غالب کے تخیل اور تراکیب کو میر کی زبان وبیان کی سادگی سے ادا کرنے کا رجحان پیدا ہو رہا تھا۔ اگرچہ یہ رجحان سست رو تھا مگر لکھنؤ کی شعری تاریخ پر اس کے بہت دور رس اثرات مرتب ہوئے۔

بیسویں صدی میں لکھنؤ میں پیدا ہونیوالی اس نئی شعری روایت کا سلسلہ ایک جانب تو قدیم شعری روایت سے منسلک نظر آتا ہے اور دوسری طرف اس میں جدید سیاسی اور سماجی شعور کی لہریں بھی موجزن نظر آتی ہیں۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ لکھنؤ کی مبینہ خارجی شاعری کی روایت کو بیسویں صدی کے اجتماعی شعور نے شدید ضرب لگائی تھی اور اب اس عہد میں یہ خاص رنگ بالکل ختم تو نہیں ہوا لیکن پھیکا ضرور پڑ چکا تھا۔

عام طور پر اُردو شاعری کے نقادوں نے دلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کو ایک دوسرے سے ممیز کیا ہے۔ دلی کی شاعری جذبات و واردات قلبی اور داخلی احساسات و تجربات کے بیان سے مخصوص سمجھی گئی، جب کہ لکھنؤ کی شاعری خارجی محرکات، معاشرتی آداب اور ایک خاص قسم کی معروضی کیفیت کی حامل قرار دی گئی۔ معروف نقاد **فراق گورکھپوری** نے ان دونوں کا فرق بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ...... دلی کی شاعری عشق کا بیان کرتی ہے اور لکھنؤ کی شاعری معشوق کا۔ موصوف اس ضمن میں مزید لکھتے ہیں کہ میر کا سوز مصحفی کے ہاں ساز بن گیا ہے۔ سوز کی داخلی کیفیت کا ساز کے خارجی وجود میں تبدیل ہو جانا طرز دلی کا طرز لکھنؤ میں ڈھل جانا ہے اور یہ کہ لکھنؤ میں داخلی واردات کی جگہ خارجی مشاہدات نے لے لی، لکھنؤ کو ایک علیحدہ دبستان کی حیثیت نہیں دیتی۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اُردو کی شعری روایت کا ارتقاء اور اس کی منطقی نہج تھی کہ اس نے فطرت سے معاشرت

کی طرف، داخلی عشقیہ کیفیات سے خارجی معشوق کی طرف اور معانی سے فن کی طرف سفر کو جاری رکھا، گویا لکھنؤ کی روایت دلی ہی کی شعری روایت کی توسیع تھی۔ تاہم جب فن پر زور زیادہ دیا جانے لگا تو رعایت لفظی لفاظی بن گئی اور یہ صنعت تصنع کے حدود میں داخل ہوگئی، چنانچہ لفظ کا رشتہ معانی سے ٹوٹ گیا اور اسی ٹوٹے ہوئے رشتے کو پھر سے جوڑنے کے لئے لکھنؤ کے معروف اور مستند شعرا صفی، عزیز، ثاقب، محشر، اثر اور آرزو وغیرہ اپنے اپنے طور پر جو کوشش کر رہے تھے، وہ غزل کی داخلیت کو وزنی اور گھمبیر اور اس کے تخیل کو باوقار بنانے کے ساتھ ساتھ اس کی خارجی ہیئت اور لب ولہجہ کی تشکیل و تعمیر پر بھی اثر انداز ہو رہے تھے۔ ان کی یہ کوششیں اپنی ذات تک محدود نہ تھیں، بلکہ ان کے شاگرد بھی اپنے اساتذہ کی کوششوں میں برابر کے شریک تھے۔

آل رضا نے شعر گوئی کا آغاز کیا تو **آرزو لکھنوی**، لکھنؤ کی مروجہ غزل گوئی کو ایک نیا لب ولہجہ اور بانکپن عطا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اب شاعری "دو جمع دو مساوی چار" والی روایت سے کافی آگے بڑھ چکی تھی۔ مذکورہ شاعروں نے شاعری کو لفظی بازی گری اور لفظوں کے گورکھ دھندے سے نکال کر ایک معتبر منزل تک پہنچایا۔ آل رضا سمیت ان تمام شعراء نے غزل کو اس مقام پر لے جانے کی کوشش کی، جہاں وہ معاشرے کے چند افراد کے محض تفنن طبع کا نہیں بلکہ غور وفکر کا سامان بھی فراہم کر سکے۔ اس معاشرے میں، جہاں اٹھتے بیٹھتے شعر "ہو جایا" کرتے تھے، جہاں بات بات پر شعر پڑھے جاتے تھے، جہاں شعر گوئی روزمرہ بن گئی تھی، مذکورہ شعراء نے کڑی شرطیں عاید کر کے اور اعلیٰ معیار کے عملی نمونے پیش کر کے اسے پھر "مشکل" بنا دیا۔ اس طرز احساس نے غزل کی جدید روایت کے لئے راہ ہموار کی۔ یہ انہی شعراء کا فیضان تھا کہ ان کی تربیت و تہذیب سے ایسے ایسے شعراء یہاں جلوہ گر ہوئے، جنہوں نے اُردو شعر کی تاریخ کو مزاج اور مذاق کے لحاظ سے یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔

حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں غزل کی اہمیت اور افادیت کو تو تسلیم کیا مگر غزل کے مروجہ موضوعات کو تبدیل کرنے پر زیادہ زور دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے انجمنِ پنجاب کے ذریعے نظم کے فروغ کے لئے مقدور بھر کاوشیں کیں۔ ان دونوں صورتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ غزل کی حیثیت متاثر ہونے لگی اور نظم گوئی کو عروج حاصل ہونے لگا۔ اس کے علاوہ بیسویں صدی کے اوائل میں مغربی شاعری کے اثرات سے شعراء کے ذہنوں میں نظم گوئی کے لئے زیادہ سازگار حالات پیدا ہونے لگے۔ ایک ایسے دور میں، جب کہ ہر طرف نظم گوئی کا چرچہ ہو اور ہر صنف پر اسی کو فوقیت دی جا رہی ہو۔ غزل کی جانب توجہ دینا بجائے خود ایک بدعت بھی تھی اور معاشرے کے غالب رجحان سے بغاوت بھی۔ بغور دیکھیے تو مذکورہ غزل گو شعراء کی مدبرانہ حکمت عملی میں زمانہ شناسی اور دور اندیشی موجود تھی۔ نیز یہ کہ وہ غزل جیسی ہمہ گیر اور ہمہ جہت صنف کی آفاقی حیثیت کو بھی جانتے پہچانتے تھے اور آزاد و حالی کی تحریک کی افادیت کے بھی منکر نہ تھے۔ یعنی وہ غزل کو زندہ رکھنے کی تدبیر جاری رکھنا چاہتے تھے اور نظم گوئی کی وسعت و پہنائی کے بھی قائل تھے۔ وہ دونوں، اصناف کو باہم گر حریف بنانا نہیں چاہتے تھے اور موضوعات نظم گوئی کے رجحان کے حق میں جو فضا پیدا ہو چکی تھی، اسے زندہ رکھتے ہوئے غزل کی مثبت حیثیت کو بحال کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انجمنِ معیار کے ذریعے متذکرہ بالا شعراء نے یہ اہم خدمت انجام دی کہ معیاری غزل گوئی کی تحریک چلا کر دبستانِ لکھنؤ کو معتبر بھی بنایا اور صنفِ غزل کو مرنے بھی نہ دیا۔ آلِ رضا نے اسی عہد کے ممتاز شعراء کے دامنِ تربیت سے فیض حاصل کیا۔ انہوں نے ایک ایسے دور میں غزل کی صنف کو اپنے شعری اظہار کا ذریعہ بنایا، جب وہ وقیع صنف کی حیثیت سے اپنی اہمیت کھو رہی تھی۔ ان شعراء نے نہ صرف یہ کہ نظم نگاری کی فضا میں غزل گوئی کو اختیار کیا بلکہ جدید نظم کے بنیادی محاسن کو غزل کے مزاج میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ یہ کہنا تو بلاشبہ درست نہیں کہ اگر آلِ رضا اوران کے عہد کے غزل گو شعراء نہ ہوتے تو اس صنف کا وجود ہی

ختم ہو جاتا، لیکن یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ان معتبر اور باوقار شعراء کی کاوشوں نے نظم نگاری کی تند و تیز تحریک کے زمانے میں بھی غزل کی شمع کو بجھنے نہ دیا۔

آلِ رضا لکھنو کے ایک ایسے دور سے تعلق رکھتے تھے، جس میں لکھنوی تہذیب و تمدن کی جلوہ افروزیاں اپنے عروج پر تھیں۔ آلِ رضا نے اس تہذیب و تمدن کو اپنی شاعری میں محفوظ کرنے کی کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ اس اعتبار سے آلِ رضا کی شاعری کی اہمیت کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ وہ اس دور کی نشاندہی کرتی ہے، جواب لوٹ کر کبھی نہیں آئے گا اور جب بھی اس عہد کے سماجی مطالعے کی ضرورت پڑے گی تو آلِ رضا کی شاعری ایک صاف شفاف آئینے کی طرح اپنے عہد کا عکس پیش کردے گی۔ اس اعتبار سے ہم آلِ رضا کی شاعری کو ایک عہدِ گم گشتہ کی کہانی سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔

واہ رے یادِ عہدِ تمنا، دل کی سجاوٹ کیا کہیے
باسی پھول میں جیسے خوشبو، پھول پہننے والے کی

اس طرزِ احساس کا ایک منفی پہلو آپ یہ پیش کرسکتے ہیں کہ مذکورہ صورت میں تو آلِ رضا کی شاعری میں جدید عہد کے مسائل و معاملات کی ترجمانی نہیں ملے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ آلِ رضا کی شاعری میں آپ کو شاید ریڈیکل جدیدیت تو نہ ملے لیکن ان کی شاعری میں آج کے شاعرانہ مزاج سے جو ایک قسم کا بُعد ملے گا، وہی اس کا حُسن اور خوبی بھی ہے۔

اہلِ جدت کی یہ تنقید بُری کیا ہے رضا
کہ غزل اس سے نئی چھاپ کر ڈھالی نہ گئی

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انجمنِ معیار کے اساتذہ کو جن اقدارِ حیات کا تحفظ ملحوظِ خاطر تھا، ان میں تہذیبی عناصر سرِ فہرست تھے تاہم عصری حسیت اور اجتماعی شعور جس کی سمتیں متعین ہو چکی تھیں، اس سے مطلقاً روگردانی بھی نہیں ہوسکتی تھی چنانچہ آلِ رضا کی غزل میں جدید ترقی پسند رنگ موجود ہے، صرف مارکسی نظریات نہیں ہیں۔

آل رضا کی شاعری لکھنؤ میں پروان چڑھی اور یہیں اس پر شباب آیا۔ انہوں نے لکھنؤ کی اجتماعی تہذیبی زندگی کو اور اس کے تمدنی مضمرات کو نہ صرف یہ کہ قریب سے دیکھا، بلکہ بخوبی برتا بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں لکھنؤ کے تہذیبی مرقعے چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں اور اس طرح لکھنؤ اور اس کے تہذیبی عناصر کو محفوظ کرنے کا میلان بھی ملتا ہے۔ لکھنؤ کا رہن سہن، بودوباش اور طرزِ معاشرت کی کج کلاہی ثقہ انداز میں آل رضا کی شاعری میں ملے گی۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر آل رضا کی غزل گوئی کا کینوس نہایت وسیع صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے کہ اس شعر میں انہوں نے کس طرح لکھنؤ کے ایک خاص رویے کو پینٹ کیا ہے۔

اس نے آنکھوں میں ادا کی تھی رضاؔ رسمِ سلام
دیکھتا ہو گا کوئی، ہاتھ اُٹھائے نہ بنا

سیّد آل رضاؔ نے جس دور میں غزل گوئی کا آغاز کیا، اس وقت پورے ہندوستان میں داغؔ اور امیرؔ کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ دونوں شعراء نہایت بے باکی اور والہانہ طرحداری سے اپنے اپنے نظریات کا برملا اظہار کر رہے تھے۔ آل رضا نے اپنی غزل گوئی کی بنیاد شائستہ، تربیت یافتہ اور مہذب جذبے پر رکھی، جس میں وضع داری اور رکھ رکھاؤ کا ثقہ انداز پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ داغؔ اور امیرؔ کی غزلوں میں عشق کا رویہ جو جاری و ساری تھا، دراصل زوال پذیر جاگیردارانہ ذہنیت کا غماز تھا اور اس میں جو تھوڑا سا حجاب تصوف کے کلاسیکی موضوعات کی وجہ سے باقی رہ گیا تھا، وہ بھی معرضِ خطر میں تھا۔ یہی سبب ہے کہ داغؔ اور امیرؔ کی شاعری میں رکاکت کا عنصر حد سے زیادہ داخل ہوگیا، گو وہ رنگ بظاہر بے حد مقبول تھا مگر چشمِ معنی آشنا میں اس کا مستقبل نہایت مخدوش ہوگیا تھا۔ آل رضا کے سامنے یہ تمام صورتِ حال واضح طور پر موجود تھی اور انہیں اپنی ذمہ داری کا بخوبی احساس بھی تھا۔ یہی سبب ہے کہ پرانی ثقہ روایات اور قدیم مزاج کی متانت کو پسند کرنے اور ان

پر عمل پیرا ہونے کے باوجود داغ اور امیر جلوت سے زیادہ خلوت میں رکاکت وابتذال سے کھل کھیلتے ہیں۔ اس کے علی الرغم انجمنِ معیار کے اساتذہ نے اپنے شاگردوں کی تربیت کے منہاج کا تعین مختلف خطوط پر کیا، جس میں ثقاہت ومتانت، شائستگی، تہذیب، سنجیدگی اور بہترین رکھ رکھاؤ ملتا ہے۔ اگرچہ آلِ رضا کی غزلوں میں جذبۂ عشق اور ضبطِ نفس کی وجہ سے احساس کی شدت کسی قدر کم ہوگئی ہے، مگر اسی چیز نے ان کی شاعری کو عام رنگ سے ہٹا کر امتیازی اور انفرادی رنگ سے بھی قریب کر دیا ہے۔ آلِ رضا کے دیوان ''غزلِ معلےٰ'' کے آغاز میں ان کا یہ شعر درج ہے:

اُٹھا کے بزمِ محبت سے لے گئے جن کو
عجب مزاج کی شمعیں تھیں، جل سکیں نہ کہیں

یہ شعر ان کی شاعری کے عشقیہ جذبات ومزاج کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ان کے انفرادی رنگ کی طرف توجہ دلاتا ہے، جس میں روشِ عام سے ہٹ کر الگ راہ بنانے اور اس پر چلنے کی ہمت پائی جاتی ہے۔ یہ شمع انہوں نے اس وقت روشن کی، جب پرانے رنگ میں غزل کہنے والے چراغِ سحری ہو چکے تھے۔ چند قدما کا خیال ہے کہ یہ شمع آج بھی اپنی مخصوص روشنی رکھتی ہے، جو ایک روشن تر ماضی کی یاد دلاتی ہے۔ اس شمع کی روشنی میں بڑی دلآویزی اور افسون ہے۔ کچھ سائے اسی شمع سے پیمانِ وفا باندھے ہوئے اور آنکھوں میں آنسو لئے ہوئے اس کی مدھم روشنی میں اُبھرتے ہیں اور روشنی کے اس مدھم دائرے سے نکل کر ماضی کے بے پایاں دُھندلکے میں گم ہو جاتے ہیں۔ کتنی کافوری شمعیں، عود وعنبر سے مہکتے ہوئے کتنے ہی شبستان، پھولوں کے باسی ہار اس پیلی روشنی میں اپنی دل کش چھب دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں:

سوئے تھے سرِ شام کھلی پچھلے پہر آنکھ
منہ دیکھ کے اُٹھے ہیں چراغِ سحری کا

آلِ رضاؔ کی غزل اس وقت اُبھری جب ملک گیر تبدیلیاں اس دور کی بساط کو اُلٹ چکی تھیں اور حُسن و عشق کی روایات بدل چکی ہیں۔ طرزِ معاشرت میں تاریخی، سیاسی اور ثقافتی عوامل اپنا واضح کردار ادا کر کے ماضی کا ورق اُلٹ چکے تھے اور معاشرے میں ایک نیا شعور جاگ اُٹھا تھا۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ ان کی غزل ذہنی تربیت کے لحاظ سے نئے عشقیہ شعور کو قلبی طور پر قبول نہیں کر سکی تھی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ عشق اور شاعری دونوں کی وسیع تر تعبیرات سے بے خبر بھی نہیں تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں میں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت پائی جاتی ہے۔ آلِ رضاؔ کی شاعری کا اصل مرکز معاملاتِ عشق کی ترجمانی ہے، جس میں عموماً شعراء عدم توازن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن آلِ رضا نے اس کوچے میں بھی بہت سوچ بچار کے بعد سنبھل سنبھل کر قدم اٹھایا ہے، اور یہی وہ رویہ ہے جس نے ان کی غزل میں توازن پیدا کیا ہے۔ حسن و عشق کے حوالے سے آپ ان کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور ان میں موجود تہذیب و شائستگی سے لطف اٹھایئے۔

اک آن صبح کے ساتھ، ایک آن شام کے ساتھ
بتا بھی حُسن تو کس حسنِ انتظام کے ساتھ

....

خطا معاف، نگاہوں کو کھینچ لیتا ہے حُسن
خطا معاف، یہ آنکھیں نہیں ہیں پتھر کی

....

رضاؔ کھیلنا تھا غمِ زندگی سے
محبت کو ہم نے وسیلہ بنایا

....

رضاؔ کتنی حسین اور مختصر شرحِ محبت ہے
نہ راس آئے تو دوزخ ہے، جو راس آئے تو جنت ہے

رہ و رسم عشق کی منزلیں، وہ نزاکتیں، وہ لطافتیں
کبھی لطف آفتِ جاں بنا، کبھی جھڑکیوں نے مزا دیا

....

محبت میں سکوں آمیز توجیہیں نہیں چلتیں
رضاؔ، تم نے بھی آخر اضطرابِ دل کو کیا سمجھا

آلِ رضا نے قیامِ لکھنؤ میں اپنی شعری صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا اور اپنے عہد کے ممتاز دانشوروں اور ثقہ شاعروں سے خوب داد وصول کی۔ انہوں نے صحت مند شعری روایات کو اپنی غزل میں جذب کیا اور اس شعری ورثے کو آئندہ نسل تک منتقل کرنے کا فریضہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ آلِ رضاؔ کی غزل کا ایک مؤثر پہلو یہ بھی ہے کہ ہجرت کے بعد انہوں نے لکھنؤ کی فضا میں پرورش پانے والی شعری روایت کو پاکستان پہنچایا ہجرت کے بعد وہ کراچی میں قیام پذیر ہوئے اور یہاں انہوں نے مختلف لکھنوی شعرا کی معاونت سے بہت سی انجمنیں قائم کیں اور لکھنؤ کی اسی شعری روایت کو مستحکم بنانے کی کوشش کی۔ اس سلسلے کو اس وقت مزید تقویت ملی، جب حضرت آرزوؔ لکھنوی کراچی تشریف لے آئے۔ آرزوؔ لکھنوی کا پاکستان میں نزولِ اجلال اس لحاظ سے اہم واقعہ ہے کہ لکھنؤ کے بکھرے ہوئے اور منتشر شعرا کو مرکز مل گیا اور چونکہ موصوف مرجع خلائق تھے، لہٰذا بکھرے ہوئے دانوں کی صورت میں جو ہنرمند انتشار کا شکار تھے، ایک رشتے میں پرو لیے گئے اور اصلاح و تربیت کا فیضان جاری ہو گیا۔ اس طرح اب ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ آلِ رضا نے پاکستان میں اس گم شدہ تہذیب کی بازیافت کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہندوستان اور پاکستان دونوں کی تہذیبوں کے سنگم سے ایک نئی تہذیب کو ''دریافت'' کیا۔ پاکستان میں پاکستانیت کے احیاء اور فروغ کے حوالے سے آلِ رضا کا یہ اقدام سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

آلِ رضا صنفِ غزل میں کسی خاص انقلابی طرز کے موجد نہیں ہیں لیکن اپنے نادر اسلوبِ بیان کی وجہ سے اپنی علیحدہ پہچان ضرور رکھتے ہیں۔ وہ غزل کے سانچے کو غزل کے حدود میں رکھ کر نہایت نازک اور لطیف دلی جذبات کی مصوری کرنے کے موجد ہیں، اور یہ رنگِ خاص ان کے استاد حضرت آرزو سے مستعار ہے۔ ان کا رنگِ سخن اس لحاظ سے قدرے منفرد ہے کہ اس میں نہ تو خشک فلسفیانہ افکار ملتے ہیں اور نہ صوفیانہ موضوعات۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا طرزِ بیان اس قدر دل نشیں اور مسحور کُن ہے کہ دل میں جگہ بناتا چلا جاتا ہے۔ آپ ان کی مختلف غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے اور زبان و بیان کا لطف اٹھایئے۔

دل کچھ اس طرح سے ٹوٹا کہ بنائے نہ بنا
دل کے ٹکڑے جو ملے جوڑ بٹھائے نہ بنا

....

ہم نے بے انتہا وفا کر کے
بے وفاؤں سے انتقام لیا

....

ہے شغلِ عشق رضا اور فیضِ عشق ہے اور
بنا کے تاج کوئی تاجدار ہو نہ سکا

....

جوشِ طوفاں پہ نہ اترائے ابھی عالمِ آب
ڈوبنا بھی ہمیں آتا ہے جو ساحل نہ ملا

....

ہے فرق بڑا، اے جانِ رضا، دل دینے میں دل لینے میں
اُلفت کا تعلق جان کے بھی رشتے کی نزاکت کیا جانوں

....

قسمت میں خوشی جتنی تھی ہوئی، اور غم بھی ہے جتنا ہوتا ہے
گھر پھونک تماشا دیکھ چکے، اب جنگل جنگل روتا ہے

....

چاہے جدھر کو آزادی سے کوئل جائے پپیہا آئے
کالی گھٹا آ کے قفس پر آپ بھی روئے ہمیں بھی رُلائے

....

ایک دیوانے کو دیکھا پیچھے پیچھے آپ کے
ہنس کے بیٹھا، نقشِ پا چوما، چلا روتا ہوا

....

میرا سینہ تان کے منت سے کہنا ایک اور
اُن کے خالی ہاتھ دکھلانا کہ پیکاں ہو گئے

آلِ رضا نے لکھنوی شعری روایت کے تشخص کو برقرار رکھنے کی کوشش کی اور اس روایت کو حتی المقدور آگے بڑھانے کی بھی سعی کی، مگر اس بیان سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ آلِ رضا رسمی شاعر تھے اور انہوں نے صرف روایتی اسالیب کی تکرار کی ہے۔ روایت سے اثر لینے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ شاعر کی ذاتی انفرادیت ختم ہو جائے۔ شاعر کے اپنے زمانے کے حقائق، اس کا عصری شعور، اس کے نفسیاتی اور ذہنی رویے، یہ سب اس کے انفرادی لہجے کی تشکیل میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

آلِ رضا کی غزل گوئی روایت کے شعور سے آگاہ ہے۔ غزل کے کلاسیکی لہجے کی وہ نفیس روایت اور زبان و بیان کا وہ بلیغ احساس، جو آرزو لکھنوی کی ''سریلی بانسری'' بن گیا تھا، آلِ رضا کی ''غزلِ معلیٰ'' کے اسی شعری سانچے میں ڈھل کر ایک غنائی اشارہ بن گیا۔

آلِ رضا کی غزل ہمارے عہد کے لئے کیا معنی رکھتی ہے؟...... اس سوال کا

جواب ہی انہیں اُردو کی شعری روایت میں ایک خاص مقام عطا کرے گا۔ آلِ رضا کی غزل آرزو لکھنوی یا جلال لکھنوی کی روایت غزل گوئی کی آخری کڑی ہے۔ اس روایت کی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے موضوع اور اسلوب کے تقاضوں سے عہدہ براء ہو کر غزل کو بیسویں صدی کی اُردو شاعری میں اہم صنف کے طور پر زندہ رکھا۔

بیسویں صدی کے نئے تقاضے زندگی کی نئی معنویت کو شعری پیکر عطا کرنا چاہتے تھے۔ مصلحین کے حملوں نے پرانے شعری سانچوں اور معاشرتی نظام پر شدید نکتہ چینی کی کہ اجتماعی زندگی کے سانچے تبدیل ہو رہے تھے اور شاعری کے تقاضے بدل رہے تھے۔ ایسی صورت میں غزل کو چند داخلی تبدیلیوں کے ساتھ زندہ رکھنا ایک وقیع کارنامہ تھا۔ آلِ رضا کی غزل مصلحین اور محسنین کی شاعری اور ہمارے عہد کی جدید غزل کے مابین ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی اس کی اہمیت ہے اور یہی اس کا تاریخِ ادبیات اُردو میں بطور سنگِ میل ایک افادی پہلو ہے۔

رُکے تو پاؤں پکڑ لے یہیں زمیں نہ کہیں
چلے چلو کہ وہ مل جائیں گے کہیں نہ کہیں

◆◆◆

madblib.org

◆◆◆

ڈاکٹر آغا سہیل کی افسانہ نگاری

◆◆

شعروادب کی نامور ہستیاں اپنے فکری جلال و جمال کی وجہ سے حیات جاوداں کی حقدار ہو جاتی ہیں۔ ان کی تحریریں ان کی شخصیت کے متنوع پہلوؤں کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ ان کی معلومات ومشاہدات اور جذبات واحساسات کے طرز اظہار سے مصنف کے علاوہ اس دور کے پورے حالات کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ ہر باشعور مصنف کی تحریر کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے اور یہی مقصدیت زندگی کی روح اور ادب کی جان ہوتی ہے۔ اسی سے مصنف کی پختہ کاری، وسیع المشربی اور روشن ضمیری کا اندازہ ہوتا ہے۔

شاعر ہو یا ادیب وہ عوامی شعور سے اپنا ذاتی شعور منسلک رکھتا ہے۔ اس کی تخلیقات میں معاشرتی حالات و واقعات، سماجی عیوب ومحاسن اور تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ عظیم شاعر اور اعلیٰ پائے کا مصنف اپنے شعور وادراک کو اخلاقی قدروں سے جوڑ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عظیم تخلیق کار کسی عہد یا خطے تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس کی تخلیق میں پوری کائنات کے مسائل موجود ہوتے ہیں اور وہ تخلیق پوری دنیا پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔ بظاہر تو وہ اپنے جذبات ونظریات کی پیش کش کرتا ہے مگر اس کی تحریریں اس دور کے ہر انسان کے دھڑکتے ہوئے دل کی ترجمانی کرتی ہوئی نظر آتی

ہیں۔ افسانے ہوں یا مقالات، خاکے ہوں یا سفرنامے، ناول ہوں یا مضامین سب کے سب ابلاغ فکرونظر اور اظہار حسنِ عمل کے ذریعے ہیں۔کور چشموں کی تو بات الگ ہے تاہم چشم معنی آشنا ان تخلیقات میں پوری انسانیت کا شعور جلوہ گر دیکھ سکتی ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ عظیم فنکار کا اسلوب تحریر قاری کو متاثر کرنے کا سبب بنتا ہے۔ انسانی سادگی، بے تکلفی اور بے ساختہ انداز کا ہمیشہ رسیا رہا ہے اسے یہ باتیں جس مصنف کی تحریر میں نظر آتی ہیں وہ اسے اپنا آئیڈیل بنالیتا ہے۔ اب یہ مصنف کی صلاحیت اور ہنرمندی پر منحصر ہے کہ وہ آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کرے تا کہ اس کے حلقہ اثر میں اپنی ذات نہیں بلکہ کل کائنات آجائے۔

یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ تقسیم برصغیر کے وقت ہمارا تہذیبی اور ثقافتی ورثہ زمانے کے ہاتھوں برباد ہو گیا۔ بجی سجائی تہذیب اُجڑ گئی اور بیش بہا علمی اور ادبی سرمایہ برباد ہو گیا۔ نئی علمی اور ادبی مسند بچھانا اور نئی بساط فراہم کرنا صدیوں کا عمل ہے۔ اس صورت حال کا اظہار اردو شعروادب میں بار بار ہوا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ادیبوں نے کثرت سے اپنی تحریروں میں اس کرب اور بے چینی کا اظہار کیا ہے جس سے وہ براہ راست یا بالواسطہ متاثر ہوئے۔ مقام مسرت ہے کہ ہمارے ادیبوں نے بگڑی ہوئی ادبی صورت حال کو سہارا دیا اور بے سروسامانی کے باوجود ایسے ایسے فن پارے تخلیق کیے جن کا عالمی سطح پر استحسان اور استقبال ہوا۔ آج انہی عظیم تخلیق کاروں کی بدولت پاکستان کا ادبی سرمایہ کسی بھی دوسرے ملک کے علمی و ادبی سرمائے سے کم نہیں ہے۔ پاکستان کے علمی و ادبی سرمائے کو سربلند، معتبر اور فزوں تر بنانے والے فنکاروں میں ایک معزز اور معتبر نام ڈاکٹر آغا سہیل کا بھی ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور زوال آمادہ لکھنؤ کی رونقوں کو اپنی نگاہوں میں سمیٹ کر پاکستان آگئے۔ یہاں آکر انہوں نے لکھنوی تہذیب وثقافت کو حرز جاں بنائے رکھا مگر جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ پاکستانی تہذیب وثقافت لکھنوی مزاج

کو برداشت نہیں کرسکتی۔ آغا سہیل کا وصف یہ ہے کہ انہوں نے پاکستانی ثقافت کو تو دل و جان سے قبول کرلیا لیکن لکھنؤ کی نفاست اور ثقاہت کو ترک نہ کیا، اس طرح آغا سہیل کی شخصیت میں لکھنؤ اور لاہور کی ثقافت کے جوہر یکجا ہوگئے ہیں۔

آغا سہیل کی ادبی زندگی کا آغاز تو لکھنؤ میں ہوا لیکن اس پر شباب لاہور میں آیا۔ ان کی تمام تصانیف لاہور میں طبع ہوئیں اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اہلِ لاہور کی علمی و ادبی خدمت کرتے گزرگیا۔ آغا سہیل کے اعتراف عظمت کے لیے کئی تقاریب ہوئیں اور ان کی علمی و ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے کئی سیمینار منعقد ہوئے۔ برصغیر پاک و ہند کے تمام معتبر ناقدین نے آغا سہیل کی فنی ہنرمندیوں کا اعتراف کیا ہے۔ راقم الحروف نے ''آغا صاحب'' کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی اور ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور کا 'آغا سہیل نمبر' نکالا جسے ادب کے ناقدین نے بے حد سراہا۔ سر دست آغا سہیل کے تمام رُخوں کا احاطہ ممکن نہیں تاہم ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

ڈاکٹر آغا سہیل اردو کے معروف افسانہ نگار تھے وہ نصف صدی تک اس صنف کی آبیاری کرتے رہے۔ ان کے سینکڑوں افسانے معروف علمی و ادبی رسائل میں طبع ہو کر اربابِ دانش و بینش سے خراجِ تحسین حاصل کرچکے ہیں۔ رحلت سے قبل ڈاکٹر آغا سہیل کے افسانوں کے درج ذیل پانچ مجموعے بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکے تھے۔

(ا) بدلتا ہے رنگ آسماں (۱۹۷۵ء)

(ب) شہرِ نا پرساں (۱۹۸۳ء)

(ج) تل برابر آسمان (۱۹۸۶ء)

(د) اگن کنڈلی (۱۹۹۱ء)

(ر) بوند بوند پانی (۱۹۹۵ء)

آغا سہیل لکھنوی تہذیب و تمدن کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ انہوں نے اس

تہذیب کو اُجڑتے بلکہ مٹتے دیکھا۔ان کی دیرینہ خواہش رہی کہ اس بگڑتی تہذیب کی عظیم روایات کسی بھی قیمت پر محفوظ ہو جائیں وہ عملی طور پر تو کچھ نہیں کر سکتے تھے لیکن علمی سطح پر انہوں نے اپنی تحریروں میں اس تہذیب کے نقش و نگار کو محفوظ کرنا شروع کر دیا جس طرح غالب نے مغلیہ تہذیب کو اپنی شاعری میں محفوظ کر دیا ہے بالکل اسی طرح آغا سہیل نے لکھنوئی تہذیب و معاشرت اور عادات و رسومات کو اپنے افسانوں میں محفوظ کرنے کی شعوری کوشش کی۔آپ آغا سہیل کے لکھے ہوئے ابتدائی افسانے پڑھیئے ،زندہ لکھنؤ سے آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔

ڈاکٹر آغا سہیل ترقی پسند تحریک سے عملی سطح پر متاثر بلکہ وابستہ رہے ہیں۔یہی سبب ہے کہ سماج کے بدلتے ہوئے رجحانات اور رویوں پر ان کی گہری نظر رہتی تھی۔وہ عصری تحاریک، معاشرتی کشمکشوں، سیاسی اتار چڑھاؤ اور تہذیبی تبدیلیوں سے بطور خاص آگاہ رہے اور یہ تمام باتیں ان کے افسانوں میں نہایت فنکاری کے ساتھ جگہ بناتی تھیں۔ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ اپنے افسانوں کو ترقی پسندانہ خیالات کا مظہر تو بنائیں لیکن نظریے کو نعرہ نہ بننے دیں۔یہی سبب ہے کہ ان کے افسانوں میں ایک خاص ٹھہراؤ اور سکون کی کیفیت جلوہ گر ہے جو قاری کے دل و دماغ پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل کے افسانوں میں ایک ارتقائی سفر کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔ان کے ابتدائی افسانوں میں مقامیت کا عنصر نمایاں ہے۔وہ لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کے بیان میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کرتے رہے۔لکھنؤ سے ان کی جذباتی وابستگی میں اس وقت کمی محسوس ہوتی ہے جب وہ پاکستانی تہذیب و ثقافت کو ذہنی طور پر قبول کر لیتے ہیں۔اس زمانے کے افسانوں میں مقامیت سے زیادہ وطنیت کا احساس جلوہ گر ہے اس کے بعد وہ وطنیت کا دائرہ توڑ کر بین الاقوامی سطح کو چھوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اس عہد کے افسانوں میں تیسری دنیا کے مسائل بطور خاص ان کا موضوع بنتے ہیں۔انہوں نے اس دور

میں مجبور ومظلوم اور بے کس عوام کے مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ اس دور کے افسانوں میں آغا سہیل کا ذہنی اُفق وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ آغا سہیل کے افسانوی سفر کی اگلی منزل مابعد الطبیعیاتی عناصر کی پیش کش ہے۔ ان کے بہت سے افسانوں میں روحانی اور مابعد الطبیعیاتی عناصر کی گونج سنائی دیتی ہے۔ آغا سہیل کا یہ افسانوی سفر نصف صدی تک جاری رہا اور اب ان کی رحلت کے بعد ان میں سے نئے نکات دریافت کرنا ناقدین اور محققین کا کام ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل کے افسانوں میں نفسیاتی ژرف بینی بھی ملتی ہے۔ ان کے بیشتر افسانے نفسیاتی کشمکش کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ نفسیاتی کشمکش کبھی جنسی الجھاؤ کے سبب سے ظاہر ہوتی ہے اور کبھی اس کا محرک معاشرتی ہیجان خیزی بنتی ہے۔ آغا سہیل ایک ماہر اور چابکدست افسانہ نگار کی طرح ان گتھیوں کو سلجھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات قاری ان کے افسانوں میں سطحی جنسی جذبات بھی محسوس کرتا ہے لیکن اسے جلد ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ بین السطور میں کتنی بڑی بات یا حقیقت پوشیدہ رکھی گئی ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل کے افسانوں میں طرح طرح کے کردار ہمارے سامنے آتے ہیں، ان کے زیادہ تر کردار واحد متکلم ہوتے ہیں جو مصنف کی اپنی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ آغا سہیل کے کردار وقتی طور پر تو قاری کے ذہن پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن وہ اپنا پائیدار نقش ثبت نہیں کر پاتے۔ یہی سبب ہے کہ آغا سہیل کے افسانوں میں کوئی ایسا جیتا جاگتا کردار خلق نہیں ہوا جو افسانوی تاریخ میں جگہ پاسکے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آغا سہیل کے نسوانی کردار مردوں کی نسبت زیادہ جاندار اور پائیدار ہوتے ہیں اور وہ قارئین پر ایک گہرا تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ آغا سہیل کے افسانوں میں زبان کی کئی سطحیں ملتی ہیں تاہم سب پر لکھنوی زبان کا سایہ ہے۔ آغا سہیل لکھنؤ کی ثقہ اردو بولتے اور لکھتے ہیں یہی سبب ہے کہ ان کے افسانوں کی زبان کوثر سے دھلی معلوم ہوتی ہے۔ آغا سہیل کے افسانوں میں

کومل اور نازک الفاظ بعض اوقات ثقیل خیالات کو بھی سادہ اور عام فہم بنا دیتے ہیں۔ آغا سہیل شعوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کے افسانوں کی زبان موضوع کے عین مطابق ہو تاہم بعض اوقات فطری طور پر ان کی زبان ثقیل ہو جاتی ہے۔ آغا سہیل کی افسانوی لغت جان لینے کے بعد قاری پرسکون طریقے سے افسانے کے مزاج واسلوب سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

اب ذیل میں آغا سہیل کے افسانوں کے پانچوں مجموعوں پر ضمنی طور پر چند معروضات پیش خدمت ہیں:

(ا)

ڈاکٹر آغا سہیل کے افسانوں کا پہلا مجموعہ **"بدلتا ھے رنگ آسماں"** اقبال بک کارنر لاہور سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ اردو کے معروف ترقی پسند شاعر حسن عابد کے نام معنون کیا گیا ہے۔ آغاز میں مصنف کے کوائف اور تصانیف کے نام درج ہیں۔ دوسرے مجموعوں کے برعکس یہ مجموعہ ملک کے معروف ناقدین کی آرا سے مزین ہے۔ کتاب کے ڈسٹ کور پر محمد علی صدیقی، الطاف فاطمہ، احتشام حسین، احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور، جون ایلیا، احمد جمال پاشا اور ڈاکٹر شارب ردولوی کی آرا بھی پیش کی گئی ہیں۔ ۳۱۹ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ صوری اعتبار سے دلکش ہے۔

"بدلتا ہے رنگ آسماں" میں درج ذیل چوبیس (۲۴) افسانے شامل ہیں:

(۱) پتنگا	(۲) سہ پہل	(۳) ہار
(۴) رشوت	(۵) رشتہ	(۶) ٹوٹی چمنی
(۷) بازی گر	(۸) ٹھکانہ کہیں نہیں	(۹) سموروار کوٹ
(۱۰) آخری مورچہ	(۱۱) شگاف در	(۱۲) مالکن
(۱۳) من ماں راکھوں	(۱۴) موئے آتش دیدہ	(۱۵) پان
(۱۶) پرچم	(۱۷) کنجی	(۱۸) بدلتا ہے رنگ آسماں

(۱۹) ڈبویا مجھ کو (۲۰) محل سرا (۲۱) قوم

(۲۲) دعا (۲۳) زبان خنجر (۲۴) آخری ہاتھ

"بدلتا ہے رنگ آسماں" کی اشاعت کے بعد ناقدین نے اس مجموعے کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی اور اس مجموعہ کو جدید اردو افسانے میں ایک سنگ میل قرار دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آغا سہیل نے ان افسانوں میں ایک بدلتے ہوئے سماج کا قصہ چھیڑا اور ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے نقوش اُجاگر بلکہ محفوظ کرنے کی کامیاب سعی کی۔ اس کتاب کا عنوان بھی آسمان کی اس گردش کا احاطہ کرتا ہے جو ایک زمانے، تہذیب اور تمدن کو ختم کر کے دوسرے دور کی تہذیبی اور تمدنی روایات کو ہمارے سامنے لاتا ہے اس حوالے سے ڈاکٹر سہیل احمد خان کی یہ رائے انتہائی وقعت کی حامل ہو جاتی ہے:

"The Short Stories of Agha Suhail take their shape from two spheres of experience. The dominant theme of these stories is a pattern of life which is slowly vanishing away, some vivid characters with their cultural peculiarities, reminiscences of Lucknow and a set atmosphere of cultural values. The other side of Agha Suhail's fiction portrays the social changes of the recent past. Agha Suhail, with a disturbed vision looks at the moral degeneration, nugrations and clashes which are the product of recent historical situation of the sub-continent. The title of his book toc suggests this change and upheaval."

(The Pakistan Times, August 31, 1975)

اس افسانوی مجموعہ میں موضوعات کے ساتھ ساتھ آغا سہیل نے زندہ زبان استعمال کی

ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مخصوص موضوعات کو آغا سہیل نے عمومی موضوعات کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور زبان و بیان پر ان کی قدرت نے اسے چار چاند لگا دیے ہیں اس مجموعہ کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کی رائے سن لیجیے۔

> ''آغا سہیل کے یہ افسانے موضوعات، کہانی کی بنت، زبان و بیان اور سلیس انداز اظہار کے لحاظ سے جدید افسانہ نگاری کے سنگ میل ہیں۔ بظاہر ننھے منے مگر معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور سیاسی لحاظ سے نہایت بلیغ موضوعات کو اپنے افسانوں میں سمو کر آغا سہیل نے ایک نہایت باشعور فنکار ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔''
>
> (رسالہ 'فنون' لاہور، دسمبر ۱۹۷۵ء)

''بدلتا ہے رنگ آسماں'' میں آغا سہیل نے افسانوں کے مختلف ذائقوں سے قارئین کو روشناس کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے اس مجموعے میں رنگارنگ افسانے قاری کے ذہنی اُفق کو وسیع کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

> ''اس مجموعہ میں اردو افسانے کے بیشتر نئے اور پرانے رجحانات کی جھلکیاں موجود ہیں۔ بعض افسانے خالصتاً شرقی ہیں اور ان میں مصنف کا اصلاحی جذبہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ چند ایک افسانوں پر ترقی پسندیت غالب ہے اور ان میں افسانہ پروپیگنڈا کی سطح کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ کچھ افسانوں میں صرف ایک لمحاتی تاثر کو گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ چند ایک افسانے علامتی طرز اظہار میں بھی لکھے گئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آغا سہیل ادب کو کسی ایک خانے میں مقید نہیں کرتے بلکہ ہر نئے تجربے کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔''
>
> (ڈاکٹر انور سدید، رسالہ 'اوراق' لاہور، نومبر ۱۹۷۵ء)

اس افسانوی مجموعہ کے بارے میں یوں تو ہر ناقد نے اپنے اپنے وقیع خیالات پیش کر کے اس کے مطالعہ کے نئے نئے گوشے دریافت کیے ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز راہی اس

مجموعہ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''بدلتا ہے رنگ آسماں'' اس لحاظ سے ایک مختلف مجموعہ ہے کہ اس میں عصری تکنیک اور عصری فکر سے ایک حد تک گریز کا رویہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ممکن ہے افسانہ نگار نے شعوری طور پر ایسا کیا ہو لیکن اس رویے نے ان کے افسانے کو تھکے ہوئے اس فریم میں فٹ کر دیا ہے جسے نیا دور کب کا رد کر چکا ہے۔ اسی طرح فرسودہ تکنیک کو استعمال کر کے اپنے موضوعات کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ آغا سہیل نے بہت سے افسانوں میں بڑی بات کہنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کا اسلوب اور افسانے کی بُنت تاثر بڑھانے میں مانع رہی ہے۔ ان کا افسانہ ''رشوت''، ''ٹوٹی چھنی'' اور ''آخری مورچہ'' اسی ذیل میں آتے ہیں جہاں اسلوب اظہار میں رکاوٹ بنتا ہے۔

(ڈاکٹر اعجاز راہی، رسالہ 'احساس' پشاور، ستمبر ۱۹۷۵ء)

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجموعہ ڈاکٹر آغا سہیل کی پراثر شخصیت اور مہذب اسلوب کی نمائندگی کرتا ہے۔ آخر میں شبنم رومانی کی یہ رائے بھی ملاحظہ فرمائیے:

''آغا سہیل میاں آدمی ہیں۔ نہایت صاف ستھرے، مہذب اور متین، وضع دار اور وفا شعار۔ جاں نواز اور مہمان نواز۔ ان کے چوبیس افسانوں کا نیا مجموعہ ''بدلتا ہے رنگ آسماں'' حال ہی میں آیا ہے۔ یہ افسانے زندگی کی اعلیٰ اقدار کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ہمیں محمد علی صدیقی صاحب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ آغا سہیل نے اپنے لہجہ میں بات کرنے کا ڈھنگ نکالا ہے اور ان کے افسانے بھی ان ہی کی طرح شریف زادے ہیں۔''

(شبنم رومانی، روزنامہ 'جنگ' کراچی، ۱۷ ستمبر ۱۹۷۵ء)

(ب)

آغا سہیل کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "**شہر ناپرساں**" پہلی مرتبہ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ سنگ میل پبلی کیشنز کے مہتمم نیاز احمد نے اسے لاہور سے شائع کیا۔ ۱۷۶ صفحات پر مشتمل یہ افسانوی مجموعہ صوری اعتبار سے انتہائی جاذب نظر ہے۔ مصنف نے یہ مجموعہ معروف افسانہ نگار شور صہبائی کے نام معنون کیا ہے۔ اس کتاب میں ابتدا مصنف کے کوائف ہیں اور بعد میں مصنف کا تحریر کردہ پیش لفظ بھی ہے۔ ڈاکٹر آغا سہیل نے اپنے مزاج کے برعکس اس کتاب میں پیش لفظ شامل کیا ہے۔ وہ اس میں رقم طراز ہیں:

"میرے پہلے مجموعہ میں کوئی دیباچہ یا پیش لفظ شامل نہیں تھا۔ میں اب بھی اس کا قائل نہیں ہوں۔ میرے ناول غبار کوچہ جاناں میں بھی یہ تکلف موجود نہیں کیونکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ قارئین براہ راست میری تخلیق سے رابطہ قائم کریں اور میرے نقطۂ نظر سے مطلقاً کوئی اثر قبول نہ کریں۔ ناقدین اور مبصرین کو بھی مرعوب کرنا مجھے ناپسند ہے۔ رہا یہ کہ میرے نقطہ نظر کی وضاحت کیونکر ہو تو اس کے لیے مجھے عرض کرنے دیجئے کہ 'ایاز قدر خود بشناس' کے مصداق مجھے اپنی طالب علمانہ حیثیت کا بخوبی احساس ہے۔ اگر اس تخلیقی سفر میں بھی میرے مساعی مشکور ہوئے تو قارئین خود ہی تقاضا کرلیں گے ورنہ معاملہ جوں کا توں ہی رہنا چاہیے۔"

(پیش لفظ، شہر ناپرساں، ص ۵)

شہر ناپرساں میں درج ذیل اکیس (۲۱) افسانے شامل ہیں۔

(۱) فاصلہ	(۲) نئی بستی	(۳) جزاک اللہ
(۴) کیوں اے بے بی	(۵) پس دیوار	(۶) سہرا
(۷) ہاتھی کے دانت	(۸) سانچ کی آنچ	(۹) انا للہ

(۱۰) گانٹھ	(۱۱) قرض	(۱۲) بڑا آدمی
(۱۳) کھویا ہوا بچہ	(۱۴) کارواں دل کا	(۱۵) اپنا آدمی
(۱۶) کبھوں تو کچھ جر جائے	(۱۷) شہرِ ناپرساں	(۱۸) کرسٹوفر
(۱۹) لمن الملک الیوم	(۲۰) وقت اٹھے گا	(۲۱) کھڑکی

ڈاکٹر آغا سہیل کے اس مجموعے میں افسانوں کی ایک قوس قزح ملتی ہے۔ مختلف موضوعات پر لکھے گئے ان افسانوں میں معاشرتی کرب بھی ملتا ہے اور ذاتی محرومیاں بھی۔ آغا سہیل نے ان افسانوں میں ان معاشرتی المیوں کا بطور خاص ذکر کیا ہے جنہیں عوام و خواص ''عام'' یا ''معمولی'' سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ان افسانوں میں آغا سہیل کا لہجہ بعض مقامات پر انتہائی ترش ہو جاتا ہے۔ مجموعی طور پر افسانوں کا یہ مجموعہ آغا سہیل کے فن اور فکر کے اعتبار سے انتہائی قابل توجہ ہے۔ اس مجموعہ کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر رقم طراز ہیں:

> ''شہرِ ناپرساں میں آغا سہیل نے اس صورتحال کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے جس نے پہلے معاشرے کو مفلوج کیا اور پھر جس کے زیر اثر افراد بے دست و پا ہو کر رہ گئے۔ نئی بستی، کیمو می اے بے بی، پس دیوار، ہاتھی کے دانت، سانچ کی آنچ اور انا اللہ جیسے افسانے اس ضمن میں بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان سب افسانوں میں آغا سہیل نے معاشرے اور فرد کی اس Equation کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے جس میں اگر نقطۂ اعتدال نہ رہے تو یہ دونوں میزان کے دو پلڑے بننے کے برعکس چکی کے دو پاٹوں میں تبدیل ہو کر انفرادی خوشی، اقتدار، عزت اور عزت نفس سب کو پیس ڈالتے ہیں۔ اسی انداز کے افسانوں میں آغا سہیل کا فن خوب نکھرتا ہے کیونکہ وہ اس انداز سے بات کرتا ہے گویا بات کی ہی نہیں جا رہی اور یہی وجہ ہے کہ ان سیدھے سجاؤ کے افسانوں میں غضب کی کاٹ ملتی '' (سالہ 'فنون' لاہور)

(ج)

ڈاکٹر آغا سہیل کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ **"تل برابر آسمان"** "سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔ طباعت کے لحاظ سے یہ مجموعہ دوسرے مجموعوں سے زیادہ جاذب نظر ہے۔ ایک سو سولہ صفحات پر مشتمل اس افسانوی مجموعہ کو معروف افسانہ نگار رام لعل اور معروف نقاد ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے نام معنون کیا گیا ہے۔

"تل برابر آسمان" میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

(۱) عہد زوال	(۲) جلا ہے جسم جہاں	(۳) حصار
(۴) کھڑکی	(۵) نوشتہ دیوار	(۶) تل برابر آسمان
(۷) تسمہ پا	(۸) لمن الملک الیوم	(۹) دابۃ الارض
(۱۰) بے سمت راہیں	(۱۱) نظام	

آغا سہیل کے اس افسانوی مجموعہ میں متنوع موضوعات پر افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں ایک جانب تو آغا سہیل کا مخصوص کلاسیکی رنگ جھلکتا ہے اور دوسری جانب مخصوص طرز سے بچنے کا شعوری احساس بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔ ان افسانوں میں پھیلاؤ سے زیادہ اختصار عمل نظر آتا ہے اس مجموعے کے حوالے سے مشہور کالمسٹ ایریل (Ariel) کی ذرا طویل رائے ملاحظہ فرمایئے:

"Our fiction writers would have to work hard to ensure that the techniques of surface action are wholly different from the techniques of inside journeys'. They would have to equip themselves to deal with the challenge and that includes comprehensive absorption of vast reservoir of academic

truths of a host of disciplines.

Recently I went through Agha Sohail's latest collection of short stories "Till Barabar Aasman", containing 14 stories. It was an unusual experience of coming across a case of total transformation. Agha Sohail seeks to have the criticism of surface action, fiction that he is, at the moment, the antithesis of what he has been so far.

From the first story Ahd-i-Zawal to Nizam one comes across and unusual atmosphere, reminding here and there of an abstract intellectual atmosphere, which is best left unexplained. The symbolism is flashed on our consciousness with such a speed that one wonders whether it is the turbulence of the writer himself or the turmoil inside his character. For a progressive short story writer like him the society appears to be transforming itself... as if at the behest of those who stand to gain from the tranformation itself. We have been used to the transformations of Intezar Hussain but they are, at their best, a recoil from the fait acompli of modernity.

Agha Sohail on the contrary has

been taken aback at the rapidity with which the obscurantists are busy disinforming, making monsters of human beings in the process. Agha Sohail is in one way, the antithesis of Intezar Hussain.

The stories "Til Barabar Aasman", "Khirki" and "Be Samt Rahain" from a traid round which the whole thought process revolves and there is no doubt that Agha Sohail has emerged as and accomplished craftsman who is equipped with the techniques of the inward journey.

Very few short story writers have worked towards a restatement of their creative prowess and it is heartening that we have in our midst a short story writer who has successfully dealth with the flux.

(Dawn - Feb. 6, 1987)

''تل برابر آسمان'' کا عنوان ڈاکٹر آغا سہیل کی وسعت نظری کی خبر دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مجموعہ کے افسانے آغا سہیل کے فکری کینوس کے پھیلاؤ کا احساس دلاتے ہیں اور یہی موضوعاتی تنوع اور رنگا رنگ اسلوب آغا سہیل کو عصر جدید کے افسانہ نگاروں میں ممتاز کرتا ہے۔ اس افسانوی مجموعہ کے حوالے سے ڈاکٹر وحید عشرت کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

''آغا سہیل کے یہ افسانے مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ گہرائی اور

وسعت لیے ہوئے ہیں۔ ان کی ہیئت اور فکر میں امتزاج بھی موجود ہے اور بیان میں شگفتگی، سادگی، سلاست اور تاثر ان کے افسانوں کے حسن کو دوبالا کیے ہوئے ہیں اور یہ ایک ایسا وصف ہے جو ان کے ہر افسانے کو مہکائے ہوئے ہے۔''

(ماہنامہ'شام و سحر'لاہور، جون ۱۹۹۳ء)

(۹)

ڈاکٹر آغا سہیل کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ''اگن کنڈلی ''۱۹۹۱ء میں مکتبہ عالیہ لاہور سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ کی کتابت و طباعت سطحی ہے اور اسی بنا پر یہ جاذبِ نظر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس مجموعہ کی سب سے بڑی انفرادیت اس میں موجود ڈاکٹر طارق عزیز کا دیباچہ ہے۔ یہ آغا سہیل کی پہلی تصنیف ہے جس میں کسی ناقد کا دیباچہ موجود ہے۔ ڈاکٹر طارق عزیز نے نہایت محنت بلکہ فنکاری سے آغا سہیل کی افسانہ نگاری کے موضوعات واسالیب پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ ایک سو چھبیس صفحات پر مشتمل یہ کتاب''چندا'' کے نام معنون ہے۔

''اگن کنڈلی'' میں درج ذیل اٹھارہ (۱۸) افسانے شامل ہیں:

(۱) قصہ پانچویں درویش کا	(۲) قیامت کا انتظار	(۳) شکستہ پا
(۴) کھونٹی	(۵) روشنی کی لکیر	(۶) ماں
(۷) زنگی	(۸) تریاق	(۹) قاصد
(۱۰) آنکھوں کی سوئیاں	(۱۱) سایہ	(۱۲) سراب
(۱۳) بے چراغ قبر	(۱۴) اگن کنڈلی	(۱۵) روشنی کی تلاش
(۱۶) سانڈھی	(۱۷) میرا وطن	(۱۸) چندن بردا

ڈاکٹر آغا سہیل کے ان افسانوں میں معاشرتی کرب اور سماجی آشوب کے

ساتھ ساتھ فکری زوال کا بھی احساس ابھرتا ہے۔ دوسرے افسانوں کے برعکس آغا سہیل کے ان افسانوں میں محوِ غمِ دوش ہونے کے بجائے فکرِ فردا کا احساس بھی ملتا ہے۔ آغا سہیل کے لب ولہجہ میں ایک ترشی بھی محسوس کی جا سکتی ہے "بدلتا ہے رنگ آسماں" میں جو ایک ارتعاش اور بے چینی کی کیفیت اُبھرتی ہے وہ اگن کنڈلی میں پرسکون سطح کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان افسانوں میں آغا سہیل کا لب ولہجہ کہیں کہیں اصلاحی بلکہ تبلیغی ہو جاتا ہے۔ وہ معاشرے کے مسائل پر زور وشور سے تنقید کرتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے پاکستانی مسائل کے حوالے سے علامتی رنگ میں بڑے بلیغ اشارے بھی کیے ہیں جو چشمِ معنی آشنا سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اس مجموعہ کے حوالے سے ڈاکٹر طارق عزیز کی رائے بھی سن لیجیے:

> "مقامی، قومی اور بین الاقوامی سطح کے بعد آغا سہیل کی نظریاتی اور موضوعاتی وسعت روحانی تناظر میں داخل ہوتی ہے۔ مجموعہ "اگن کنڈلی" روحانی اذیت کا وہ نقطۂ آغاز ہے جب انسانی شعور کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ یہ چوتھا مرحلہ داخلی اور خارجی کیفیات کا مکمل امتزاج ہے۔ محتاط رہیے۔ میں آغا سہیل کو صوفی یا مابعد الطبیعیاتی افسانہ نگار قرار نہیں دے رہا میرا اشارہ صرف روحانی کرب اور اس سے نجات کے عمل کی طرف ہے۔"
>
> (دیباچہ 'اگن کنڈلی' ۱۹۹۳ء، ص ۱۶)

(ر)

آغا سہیل کے افسانوں کا پانچواں مجموعہ "**بوند بوند پانی**" کے نام سے ۱۹۹۵ء میں طبع ہوا۔ یہ مجموعہ طاہر اسلم گورا نے گورا پبلشرز لاہور سے شائع کیا۔ اس مجموعہ کا انتساب قیصر تمکین کے نام ہے۔ ۹۴ صفحات پر مشتمل یہ افسانوی مجموعہ صوری اعتبار سے جاذبِ نظر ہے۔

"بوند بوند پانی" میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

(۱) سازھی	(۲) قاصد	(۳) وراثت
(۴) کلاشنکوف	(۵) قیمت	(۶) تیسری آنکھ
(۷) دی مین ان سائیڈ	(۸) وارث	(۹) بوند بوند پانی
(۱۰) کیموفلاج	(۱۱) حرامی پلا	(۱۲) دانہ پانی
(۱۳) زہر	(۱۴) عرصۂ محشر	

آغا سہیل کے اس مجموعہ میں ایسے افسانوں کی کثرت ہے جو ہماری سماجی زندگی کے منفی رویوں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ یوں تو تمام افسانوں میں معاشرتی آشوب کی جھلکیاں مختلف صورتوں میں اپنا اظہار کرتی ہیں تاہم کلاشنکوف، وراثت، عرصۂ محشر اور قاصد میں آغا سہیل نے معاشرے کی بے رخی اور ستم ظریفی کا حال دردناک انداز میں پیش کیا ہے۔ مصنف کے نزدیک اس مجموعہ کا نمائندہ افسانہ "بوند بوند پانی" ہے اور غالباً اسی افسانہ کی بنیاد پر اس کتاب کا نام بھی "بوند بوند پانی" قرار دیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آغا سہیل کے فن کو سمجھنے کے لئے یہ افسانوی مجموعہ انتہائی اہم ہے اس مجموعہ کی اشاعت پر اشفاق نقوی نے Lahore Literary Scens میں لکھا:

> In 1948, a young man with a master's degree in Urdu from Lucknow University embarked upon a literary career. He wrote short stories under the name Sohail Adeeb. Although they were published by various magazines, the author himself did not consider them to be of standard high enough to be published in book form.
>
> It was only later that he collected the stories he had written between 1955 and

1974 and had them published in 1975. By then he was teaching at the F.C. College, Lahore, had got a doctorate from the Punjab University and was known only as Agha Sohail. His first collection, if I remember correctly, was titled Shehr-i-Napursaan.

Now he has four more collections of stories besides two travelogues and books on literary criticism... 14 in all. Many of his stories have been translated into English. His last collection of 14 absorbing stories was published earlier this year and was titled Boond Boond Paani. There is a gentle flow in all stories written by Agha Sohail and his choice of words is superb. The book carries no blurb; he wants the reader to assess the merit of his writings himself.

(Daily, Dawn, Nov. 30, 1995

ڈاکٹر آغا سہیل کے درج بالا پانچوں افسانوی مجموعے ان کی حیات میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو گئے تھے۔ ۱۹۹۵ء کے بعد انہوں نے کتنے افسانے لکھے؟ اور وہ کہاں کہاں شائع ہوئے؟ یہ سوال ہنوز حل طلب ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ڈاکٹر آغا سہیل کے تمام غیر مدون افسانوں کی تدوین کی جائے اور پھر تمام افسانوں کو کلیات کی شکل میں شائع کر دیا جائے تا کہ ہم پاکستانی افسانے کی تاریخ مرتب کر سکیں۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ

شعروادب کی نامور ہستیاں متنوع الجہات ہوتی ہیں اور وہ اپنی تخلیقی سرگرمیوں کے باعث پورے عہد کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کردیتی ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل اس لحاظ سے یک معتبر تخلیق کار تھے کہ انہوں نے مختلف النوع ادبی جہتوں میں کام کیا اور ہر صنف ادب کو نی بے پناہ صلاحیتوں سے مالا مال کیا۔ اردو افسانے کو ایک نئی جہت عطا کرکے ڈاکٹر آغا سہیل نے افسانوی دنیا میں اپنے لیے ایک مستقل مقام بنالیا ہے۔ ڈاکٹر آغا سہیل کا یہ تخلیقی سفران کی رحلت سے پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ عصر حاضر میں ڈاکٹر آغا سہیل جیسے متنوع الجہات تخلیق کار نایاب نہیں تو کم یاب ضرور تھے اور اُن کے اُٹھ جانے سے شعروادب پر ایک سوگ کی کیفیت طاری ہے اور یہ عظیم افسانہ نگار اب خود ایک افسانہ بن چکا ہے۔ آج بھی آغا سہیل زبان بے زبانی سے کہہ رہے ہیں کہ ؎

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ
سُن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ

◆◆◆

◆◆◆

ایک گمشدہ تہذیب کا باشندہ۔ڈاکٹر سہیل احمد خان

◆◆

ہم ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں ہر شعبۂ حیات روبہ زوال ہے۔ یہ صورت حال اس وقت مزید المناک ہو جاتی ہے جب کوئی صاحب اسلوب انسان دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ پُر کرنے والا دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ آپ فنونِ لطیفہ کے کسی بھی شعبہ کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرما لیجیے آپ دیکھیں گے کہ ہر معتبر تخلیق کار کے اُٹھ جانے کے بعد جو خلا پیدا ہوتا ہے اسے پُر کرنا شائد اب ہمارے اختیار ہی میں نہیں ہے۔ شعروادب کا معاملہ اور بھی ابتر ہے۔ سنجیدہ فکر شاعر اور ادیب عوام کی نگاہ میں غیر مقبول ٹھہرتے ہیں اور مقبول شعراء فن کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ میرے خیال میں بڑی اور عظیم تخلیق ہمیشہ تہذیب یافتہ معاشرے میں پیدا ہوتی ہے۔ ہم لوگ کسی گمشدہ تہذیب کے باشندے ہیں۔ ہم اپنی تہذیب ہی نہیں اپنی شناخت بھی کھو چکے ہیں۔ اگر ہم اپنے معاشرے میں میر و غالب اور آزاد و حالؔی کے متمنی ہیں تو ہمیں اپنی عظیم تہذیبی روایات سے تعلق خاطر جوڑنا ہوگا۔ اگر آپ حقیقت حال جاننے کے طلب گار ہیں اور سچ سننے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو جان لیجیے کہ غالب کی طرح ڈاکٹر سہیل احمد خان بھی ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے بلند قامت نمائندہ بن کر اُبھرے اور عمر بھر اپنی مٹتی ہوئی تہذیب کی کرچیاں سمیٹتے رہے۔ جس طرح مغلیہ تہذیب کا جلال و جمال غالب کی شاعری

میں محفوظ ہو گیا ہے اسی طرح اعلیٰ تر مشرقی تہذیبی روایات ڈاکٹر سہیل احمد خان کی ذات میں جمع ہو گئی تھیں۔ جس طرح عصرِ حاضر میں غالب کا پیدا ہونا ناممکن ہے اسی طرح ڈاکٹر سہیل احمد خان جیسا استاد اور دانشور پیدا ہونا بھی ممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان خود تو دنیا سے چلے گئے مگر ان کا جلایا ہوا تہذیبی چراغ آج بھی فروزاں ہے اور ہر صاحبِ فکر و نظر کو احساس دلا رہا ہے کہ

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے

ڈاکٹر سہیل احمد خان کی علمی و عملی زندگی کا باقاعدہ آغاز اورینٹل کالج لاہور جیسی بے مثال دانش گاہ سے ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یہاں کا ہر استاد علم و ادب کی دنیا میں اپنی مثال آپ تھا۔ ڈاکٹر سید وزیر الحسن عابدی، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر عبید اللہ خاں، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور خصوصاً ہر دل عزیز استاد ڈاکٹر سجاد باقر رضوی اپنے اپنے فن میں یگانہ تھے۔ ان بلند قامت اور عظیم المرتبت ہستیوں کی کہکشاں میں سہیل احمد خان جیسے نوخیز ستارے کا طلوع ہونا اور آسمان ادب پر اپنی استادانہ حیثیت کو منوانا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اپنی بے پناہ صلاحیت اور متواتر محنت سے شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ حاصل کی۔ وہ جاہ و منصب کے طلب گار نہ تھے۔ یہی سبب ہے کہ جب اس دانشگاہ پر ہوا و ہوس اور حرص و آز کے سائے منڈلانے لگے تو وہ یہ کہہ کر گورنمنٹ کالج یونیورسٹی روانہ ہو گئے۔

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ چمن ہم تو سفر کرتے ہیں

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں انہوں نے متداولہ علوم کو رائج کرنے کی مقدور بھر کوشش

کی اور نصاب کو جدید خطوط پر استوار کیا۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور کی فضا کو یکسر تبدیل کر دیا۔ بین الاقوامی سیمینار کرائے۔ معروف دانشوروں کے توسیعی خطبات کا اہتمام کیا اور بے شمار علمی و ادبی تقاریب کا انعقاد کرایا۔ اس طرح یہ کالج ایک مرتبہ پھر اپنی گذشتہ سنہری روایات سے پیوستہ ہو گیا۔ وہ اسی ''عافیت گاہ'' سے سبکدوش ہوئے اور یہیں سے اپنی آخری آرام گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

بے جاں جہاں کے کارِ مسلسل سے ہو گئے
آخر زمین اوڑھ کے تربت میں سو گئے

ڈاکٹر سہیل احمد خان زندگی بھر شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ ان کی درج ذیل کتب زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں:

۱) ایک موسم کے پرندے (نظمیں)

۲) راہ کی نشانیاں (نظمیں)

۳) سرچشمے (تنقید)

۴) طرزیں (مضامین)

۵) داستانوں کی علامتی کائنات (تنقید)

۶) طرفین (مضامین)

۷) سیر بین (مضامین)

۸) داستان در داستان (مرتب)

۹) محرابیں (مرتب)

۱۰) رسالہ محراب (مدیر)

۱۱) کلیاتِ سہیل احمد خان (مضامین)

ہم ڈاکٹر سہیل احمد خان کی ہمہ جہت علمی و ادبی شخصیت اور فن کو درج ذیل جہتوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

ا) استاد	ب) نقاد
ج) شاعر	د) مدیر
ر) دانشور	س) منتظم

اب ذیل میں ان تمام جہتوں کے حوالے سے چند معروضات مختصراً پیش خدمت ہیں۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان ایک بے مثال استاد تھے۔ ان کی تدریسی صلاحیتوں کو ڈاکٹر عبادت بریلوی اور خصوصاً ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے صیقل کیا۔ ان کا طریقۂ تدریس دل نشیں، سادہ اور عام فہم تھا۔ وہ طالب علم کو ایک نئی اور تازہ دنیا میں لے جا کر چھوڑ دیتے تھے تاکہ وہ خود نئے نئے زمانوں کو دریافت کرے۔ وہ اپنے اندازِ بیان کے باعث عام موضوع کو بھی خاص بنا دیتے تھے اور لیکچر کے دوران ایسے ایسے نکات بیان کرتے تھے کہ عقل حیرت زدہ رہ جاتی تھی۔ انہوں نے ایم۔ اے، ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی کی سطح پر ہزاروں طلبہ و طالبات کو قلم پکڑنا سکھایا۔ انہوں نے خود تو کم لکھا لیکن ان کے شاگردوں نے اپنے استاد کی بالیدہ فکر سے نئے نئے جہانِ معانی خلق کیے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں کا طریقۂ تدریس سب سے منفرد تھا۔ وہ کلاس میں داخل ہوتے اور ڈائس پر کھڑے ہو کر جماعت پر طائرانہ نظر ڈالتے اور موضوع پر بے تکان بولتے چلے جاتے۔ راقم الحروف کو ڈاکٹر سہیل سے ایم۔ اے میں دو برس پڑھنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان کے لیکچر میں ٹھہراؤ اور ربط ہوا کرتا تھا وہ اپنے موضوع کے حوالے سے تمام اہم کتابوں اور ناقدین کے حوالے بڑے سلیقے سے دیا کرتے تھے۔ خاص طور پر وہ ایسے ناقدین اور محققین کی خوب کھنچائی کرتے تھے جو اپنی بات کو بغیر دلیل سے پیش کرنے کے عادی تھے۔ وہ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی اور حسن عسکری کے مکتبۂ فکر کے حامی اور ہم خیال تھے۔ یہی سبب ہے کہ پڑھاتے ہوئے وہ اپنے موضوع کے

تہذیبی رویوں کو خوب خوب اُجاگر کرتے تھے۔ داستان ان کا دل پسند موضوع تھا۔ انہوں نے پرانی داستانوں کو بیسویں صدی میں ایک نئے تناظر سے سمجھنے اور سمجھانے کی حتی المقدور کوشش کی۔ جب کلاس میں وہ کلاسیکی داستانوں کی پرتیں کھولتے تھے تو ہماری عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ وہ شاعری بھی بڑے دلنشیں انداز سے پڑھاتے تھے۔ ایک تو خود شاعر دوسرے وسیع المطالعہ۔ وہ ہر شاعر کے بارے میں ایسے ایسے نکات بیان کرتے تھے کہ وہ پہلو تلاش کے باوجود کسی نقاد کے ہاں نہیں ملتے۔ میر، غالب اور میر انیس پڑھاتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایک خاص طرح کی چمک نمایاں ہو جاتی تھی۔ مرثیہ پڑھاتے ہوئے انہوں نے اس صنف کے حوالے سے جو اُمید افزا نکات بیان کیے ہیں وہ آج بھی ہمارے دلوں پر ثبت ہیں۔ میں نے اپنے پورے تعلیمی دورانیے میں نہ تو ڈاکٹر سہیل کو چھٹی کرتے دیکھا اور نہ وہ کبھی تاخیر سے کلاس میں وارد ہوئے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ انہوں نے کبھی کلاس میں غیر متعلق گفتگو کی ہو یا طلبہ وطالبات کی فرمائش پر کوئی لطیفہ سنایا ہو۔ وہ علم کا ایک ایسا سمندر تھے جو طلبہ وطالبات کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔ ان کے سامنے ہمارے حافظے خاموش اور زبانیں گنگ ہو جایا کرتی تھیں۔ کلاس میں صرف ان ہی کی آواز گونجتی تھی۔ جب وہ لیکچر دے کر کلاس سے چلے جاتے تو ہمارے حواس بحال ہوتے تاہم سب کو بے چینی کے ساتھ اگلے روز کا انتظار ہوتا۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان دقیانوسی اساتذہ سے قطعی مختلف تھے۔ وہ ایک روشن خیال استاد تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کے طلبہ وطالبات کی آنکھوں میں علمی چمک دمک برقرار رہے۔ وہ نئی نئی کتابوں کو پڑھنے پر آمادہ کرتے اور اپنے کمرے میں ان پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ میں نے بیس برس کے بعد بھی اورینٹل کالج لاہور کے ایک طالب علم کو یہی کہتے سنا کہ سر سہیل صاحب جیسا کوئی نہیں! ڈاکٹر سہیل کم گفتار تھے مگر اپنے خاص شاگردوں سے بات چیت کرلیا کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً ان کی ڈانٹ ڈپٹ بھی کیا کرتے تھے۔ آپ کو

یہ جان کر حیرت ہوگی کہ آج پوری دنیا میں ڈاکٹر سہیل خان کے شاگرد موجود ہیں اور وہ ان کے انداز تدریس کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ

''سہیل صاحب جیسا کوئی نہیں۔''

اب یہ بات بلاشک و بلا تردد کہی جا سکتی ہے کہ جب تک ڈاکٹر سہیل احمد خان کا ایک بھی شاگرد باقی ہے ان کا نام زندہ اور فکر تابندہ رہے گی۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان ایک جداگانہ طرز کے نقاد ہیں۔ انہوں نے کلاسیکی داستانوں میں سے علامتی کائنات تلاش کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے علامتوں کی نوعیت اور سرچشموں کو تلاش کیا اور انہیں ایک نئی معنویت عطا کرنے کی مشکور سعی کی۔ ان کے تنقیدی مضامین عام سطح سے مختلف اور بلند ہوتے ہیں۔ حسن عسکری اور سجاد باقر رضوی کی عطا کردہ تنقیدی بصیرت کے باعث انہوں نے مغربی ادیبوں کے عمیق مطالعہ کے ساتھ ساتھ اپنے کلاسیکی ادب کو بھی جدید تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی بلیغ سعی کی۔ انہوں نے جدید اردو ادب کے معماروں کو علوم متداولہ کی روشنی میں پرکھا اور ان کے بعض نئے گوشوں کو دریافت کیا۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان کی تنقید پیشہ ور تدریسی ناقدین سے انتہائی منفرد اور جداگانہ ہے۔ ان کی تنقید میں سوچ اور فکر کے نئے نئے زاویے اُجاگر ہوئے ہیں اور یہی طرز احساس ڈاکٹر سہیل احمد خان کو ہم عصر ناقدین میں ممتاز مقام دلانے کا باعث ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان نے نظری اور عملی دونوں سطحوں پر تنقید سے ربط رکھا۔ نظری سطح پر انہوں نے ایسے موضوعات پر خامہ فرسائی کی جو عام طور پر ہمارے ناقدین کی نظروں سے اوجھل رہے ہیں۔ انہوں نے فنونِ لطیفہ، فکشن، فلسفہ، تمدن کی سطحیں، انسانی تقدیر، علامتوں کے سرچشمے، علامتی کائنات، تہذیبی رویوں کے اُتار چڑھاؤ، وجود کا شجر، وحدت کی تلاش، رباعی، سانیٹ اور چینی تہذیب اور علامتوں کی نوعیت اور معنویت کے حوالے سے جو اہم نکات بیان کیے ہیں ان کی جتنی بھی مدح سرائی کی جائے کم ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان

نے اپنے نظری مضامین کو کبھی یک ذہنی نہیں بنایا بلکہ مشرق و مغرب کے ناقدین اور دانشوروں کے افکار و نظریات سے انہیں سجانے اور سنوارنے کی حتی الوسع کوشش کی ہے۔
یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ ڈاکٹر سہیل احمد خان نے اپنے نظریات وضع کرتے ہوئے تمام دانش مندوں کی آرا کو مدنظر ضرور رکھا ہے لیکن خود کو کسی کا محکوم و اسیر نہیں کیا۔ اپنے صرف ایک مضمون ''فنونِ لطیفہ اور انسانی تقدیر'' میں انہوں نے ڈبلیو بی ییٹس، لائنل ٹرلنگ، آرچی بالڈ میکلیش، ڈانٹے، شیکسپیئر، بودلیئر، ران بو، فرانز فینن، سائمنز، ہیرالڈ سپینسر، فرانسسکو گویا، فلپ ہوفر، پزرے جوبیلو، جوزف کیمبل، جارج اسٹائیز وغیرہ کے افکار و نظریات کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا ہے لیکن کسی سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ ان دانشوروں کے افکار سے اپنا چراغِ فکر اور زیادہ روشن کر لیا ہے۔ آپ اسی مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ ڈاکٹر سہیل احمد خان کی سوچ اور فکر کے زاویے دوسرے ناقدین سے کس طرح جدا ہیں۔

> ''فن، کسی نہ کسی انداز میں انسانی تقدیر کے مسائل سے الجھتا رہا ہے۔ فنونِ لطیفہ کے بہت سے مظاہر جنہیں، ہم آج عجائب گھروں یا آرٹ گیلریوں میں غیر جانبدار مظاہر کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اپنے وقتوں میں کسی نہ کسی انداز میں تبلیغی بھی تھے مگر یہ بات عجیب ہے کہ موجودہ زمانے میں احتجاج اور نظریات کا ذکر کرنے والے مخصوص اصطلاحات کے دائرے میں محدود فنی سانچوں ہی کو صحیح گردانتے ہیں اور فنونِ لطیفہ کی تاریخ کے بارے میں سطحی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔''

(سہیل احمد خان، ڈاکٹر، طرفیں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۱۱)

ڈاکٹر سہیل احمد خان کی تنقید کا ایک اہم اور مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ وہ موضوع کے بارے میں تمام مواد کو قارئین کے سامنے لے آتے ہیں اور پھر اپنی رائے وضع کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں ایک حتمیت ہوتی ہے جو ان کی ناقدانہ بصیرت کی غماز ہے۔ اپنے مضمون

''رباعی سانیٹ اور چینی تہذیب'' میں انہوں نے رباعی کی صنف کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے تاہم تمام ناقدین کی آرا کو پیش کرنے کے بعد وہ اپنی گراں قدر رائے اُجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''چینی عالم کا یہ مضمون ادبیات کے تقابلی مطالعے کے ضمن میں ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد ایساندرو بوسانی کی تحریر پر ہے۔ تصوف کے بارے میں ان کا ایک جملہ کہ یہ مقامی مذہبی گروہ تھا، یہ لوگ عبادت بھی کرتے تھے اور شراب پینے میں بھی عار محسوس نہ کرتے تھے، بڑا سطحی ہے اور شاید ''تاریخی مادیت'' کا شاخسانہ ہے تاہم یہ مضمون ہمارے لیے کچھ ایسے اشارے مہیا کرتا ہے جن پر غور کیا جائے تو شاید کچھ نئی راہیں مل سکیں۔ رباعی کی صنف کا ایک خاص عہد میں ان علاقوں میں عروج جو کسی نہ کسی طرح چین سے رابطہ رکھتے تھے، لحۂ فکریہ مہیا کرتا ہے جب تک اس سلسلے میں کوئی واضح اشارے نہیں ملتے اس وقت تک کم از کم Quatrain اور دوسری زبانوں کی بعض ہیئتوں کی طرح جوئے چو کو رباعی کے آغاز کی بحث میں تو شامل کیا ہی جا سکتا ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے بعض ماہرین چینی تہذیب کے بعض فنون مثلاً قالین بافی اور ظروف سازی کے مسلم فنون پر اثرات کے بارے میں خاصا مواد فراہم کر چکے ہیں۔ اس صورت میں ادبی اثرات کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔''

(سہیل احمد خان، ڈاکٹر، طرفیں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۲۲)

ڈاکٹر سہیل احمد خان نے عملی تنقید بھی کی ہے۔ انہوں نے مشرق و مغرب کے شاعروں، ناقدوں، مصوروں، موسیقاروں اور فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والوں پر قلم فرسائی کی ہے۔ اردو ادبیات میں انہوں نے جہاں ایک طرف غالب، میر، اقبال، جیسے اکابرین

پر مضامین لکھے ہیں وہاں اختر الایمان، ناصر کاظمی، منیر نیازی، انتظار حسین، سعادت حسن منٹو، سلیم احمد، مظفر علی سید، ثروت حسین، ریاض احمد، اسلم فرخی اور نذیر قیصر وغیرہ کو بھی اپنی تحقیق وتنقید کا موضوع بنایا ہے۔ ان شخصی مضامین میں ڈاکٹر سہیل احمد خان کی محبت کا گرم جوش احساس تو ضرور ملتا ہے لیکن انہوں نے کہیں بھی ادبی دیانت میں کمی نہیں آنے دی۔ انہوں نے قدیم وجدید اکابرین کی مدح سرائی بھی کی ہے اور جہاں ضرورت محسوس کی ہے ان سے برملا علمی اختلاف بھی کیا ہے۔ آپ ان کے مختلف مضامین کے صرف تین اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ وہ اپنے مضمون "غالب کا ابتدائی کلام۔ مطالعے کے چند پہلو" میں رقم طراز ہیں:

"غالب نے فطری عناصر کو جس طرح فارسی تراکیب میں سمویا اس کا اثر اتنا گہرا ہوا کہ آج تک اردو شاعری میں فکری یا نظریاتی مسائل کے بیان کے لیے بالعموم فارسیت کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اقبال، راشد اور فیض اس رویے کی واضح مثالیں فراہم کرتے ہیں۔ ہندی آمیز لہجہ عموماً احساسات یا جمالیاتی فضا کو ابھارنے کے لیے کام آتا رہا۔ حفیظ جالندھری اور دوسرے گیت نگاروں کی کاوشیں اور عظمت اللہ خاں کے شعری تجربے فلسفیانہ انداز سے نہیں احساساتی فضا سے مربوط ہیں۔ میراجی نے البتہ اس لہجے میں نفسیاتی گہرائیاں اور کہیں کہیں فکری عنصر سمونے کی کوشش کی ہے اسی لیے وہ اس لہجے کے زیادہ تہ دار شاعر ہیں مگر عام طور پر افکار کے بیان کے لیے فارسیت کا اسلوب ہی کارآمد ثابت ہوا ہے۔"

(سہیل احمد خان، ڈاکٹر، طرفیں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۳۲)

۲۔ وہ اپنے مضمون "مظفر علی سید" میں ان کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"یہ قہوہ خانے کا منظر ہے۔ چند دانشور بحث مباحثے میں اُلجھے ہوئے

ہیں۔ مظفر علی سید داخل ہوتے ہیں اور پھر فلسفۂ زمان و مکاں پر ان کا بیان شروع ہوتا ہے۔ ہر شے اضافی لگنے لگتی ہے اور آخر میں سگریٹوں کا دھواں منظر پر چھا جاتا ہے۔ تمام دانشوروں کے چہرے اس دھوئیں میں چھپ جاتے ہیں۔ کتابیں، قہوہ خانہ، ادبی گفتگو اور سگریٹوں کا دھواں۔ یہ چار عناصر مظفر علی سید صاحب کی موجودگی کی خبر دیتے تھے۔ ان کے مزاج میں عجب طرح کی بے قراری تھی۔ شاید اس کا تعلق ان کی اپنی نفسیاتی کشمکش سے ہو یا پھر لہو میں شامل آبا کی بے قراری سے۔''

(سہیل احمد خان، ڈاکٹر، سیر بین، لاہور: قوسین، ۲۰۰۰ء، ص ۵۷)

۳۔ وہ اپنے مضمون ''انتظار حسین۔ تنقید کے آئینے میں'' میں رقمطراز ہیں:

''کچھ ادیبوں کی نگارشات ادبی فضا میں آتش بازی کی طرح اچانک چکا چوند کرتی ہیں۔ لوگ ایک دم متوجہ ہوتے ہیں مگر اس توجہ کو کوئی خاص معنی ملنے سے پہلے ہی یہ بکھرتے ہوئے رنگ مٹ جاتے ہیں۔ کچھ ادیب گرجتے برستے طوفان کی طرح ظہور کرتے ہیں اور کافی دیر تک چھائے رہتے ہیں مگر کوئی خاص رجحان یا تحریک گزرنے کے بعد بس ایک یاد سی باقی رہ جاتی ہے مگر کچھ ادیب ایسے بھی ہیں جن کا فن ایک درخت کی طرح آہستہ آہستہ نمو پاتا ہے۔ شروع میں ہری کونپلیں نظر کو اپنی جانب کھینچتی تو ہیں مگر عام دیکھنے والوں کو اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ درخت کتنا گھنا ہوگا۔ انتظار حسین کی مثال کچھ ایسی ہی ہے۔ ایک زمانے تک ان کی افسانہ نگاری کے امکانات کو محدود سطح پر پہچانا گیا مگر جب ان کا فن ایک ہرا بھرا درخت بن گیا تو ان کی صلاحیتوں کا اعتراف شروع ہوا۔''

(سہیل احمد خان، ڈاکٹر، طرفیں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۷)

ڈاکٹر سہیل احمد خان کا سب سے بڑا تنقیدی وصف یہ ہے کہ انہوں نے اردو زبان و ادب میں مغربی اور مشرقی ناقدین، شعرا اور مفکرین کے خیالات کو متعارف کرایا۔ ایک جانب تو انہوں نے ان معتبر تخلیق کاروں کے خیالات سے آگاہی عطا کی اور دوسری جانب معروف اور غیر معروف تخلیق کاروں مثلاً گنجپا روف، فرنانڈو پیسوا، کوافی، نیرودا، گارسیا لورکا کافکا ڈیو ہیرن اور پروفیسر توشی ہیکو ایزتسو وغیرہ پر مضامین سپردِ قلم کیے۔ دراصل ڈاکٹر سہیل احمد خان اردو نقادوں کے اس قبیلے کے فردِ فرید ہیں جنہوں نے روشن خیالی کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ وہ ''غیروں'' کی حکمت آموزی سے لطف بھی اُٹھاتے ہیں اور اسے اپنی تہذیب اور تمدن کے لیے قابلِ عمل بنانے کی مشکور سعی بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل کی تنقید کو ہم ''دانشوری'' سے موسوم کر سکتے ہیں جس میں گہرائی اور گیرائی کے باوجود ایک ایسی تازگی ہوتی ہے جو ہمارے ذہنوں کی بالیدگی کا سبب بنتی ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان فطری شاعر تھے۔ انہوں نے ابتدائی طور پر بزمی تخلص کیا اور غزلیں سنا کر مشاعروں سے داد سمیٹی تاہم انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ غزل کی نسبت نظم ان کے مزاج سے موافقت رکھتی ہے لہٰذا انہوں نے عمر بھر اسی صنف سے اپنا ناتہ جوڑے رکھا۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان کی نظموں میں ایک دانشورانہ سطح اُبھرتی ہے۔ وہ فطرت سے ہم کلام ہوتے ہیں اور فطرت کے تمام رنگ ان کی شاعری کا منظر نامہ مرتب کرتے ہیں۔ ہوا، بارش، آندھی، پھول، دریا، سمندر، پرندے، بادل، آسمان، ستارہ گاؤں، گھاس، خزاں، بہار، شاخ، درخت، پھل اور اسی قبیل کے بے شمار الفاظ ان کی شاعری کو ایک نئی معنویت عطا کرتے ہیں اگر آپ ان کی نظموں کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمائیے تو آپ دیکھیں گے کہ ایک جانب تو وہ اپنی کلاسیکی شعری روایت سے جڑے ہوئے ہیں اور دوسری جانب وہ شاعری کی بین الاقوامی جہتوں کو بھی سلیقے سے برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی نظموں کو سمجھنے کے لیے مشرقی شعری روایات کے ساتھ

ساتھ عالمی صورتِ حال سے باخبر ہونا بھی ضروری ہے۔ آپ ان کی معروف نظموں میں سے صرف کیمیا گر، گھاس کی انگلیاں، خواب، ظلِ سبحانی، جادوگر، کالی بارش، آئینے، بے وطن پرندہ، ہری شاخ، گمشدہ آواز، ہم زاد ستارے سے گفتگو، گمشدہ شہر، آشوب اور دروازے کا مطالعہ فرمالیجیے آپ خود محسوس کریں گے کہ ڈاکٹر سہیل احمد خان کی شاعری ایک نیا عہد اور نیا زمانہ تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ آپ سہیل احمد خان کی درج ذیل تین مختلف مزاج کی نظمیں ملاحظہ فرمائیے:

آگ کے پاس

عمر بھر کیمیا گروں میں رہے
کیمیا گر نہ بن سکے لیکن
آگ کے پاس زندگی گزری
آگ کے پھول دیکھتی راتیں
دن ہوئے خاک آگ میں جل کر
انگلیاں ہی جلا سکے اپنی
آگ میں جل کے آگ بن نہ سکے
آگ سے دور بھی رہا نہ گیا
اپنے شعلوں کے دائروں میں رہے

(سہیل احمد خان، ڈاکٹر، راہ کی نشانیاں، لاہور: قوسین، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳)

....

خواب

اپنے دادا کو سنایا میں نے خواب:
''میں نے دیکھا اک مکاں

جس کی دیواریں گلابی اور نیلی جالیاں
اس کی چھت پر ایک گنبد
جس پہ بیٹھے تھے کبوتر
زعفرانی، جوگیا اور کاسنی
گھر کے آگے ایک فوارے کا پانی، ایک حوض
کچھ پرندے جس سے کرتے تھے وضو!"
میرے دادا چونک اُٹھے
ایک ہلکا سا تبسم ان کے ہونٹوں پہ کھلا
چند لمحوں کے لیے یوں سوچ میں ڈوبے
کہ جیسے اپنے اندر ڈھونڈتے ہوں کوئی شے
پھر وہ یوں گویا ہوئے:
"میرے والد اک جہاں گشت آدمی تھے
قافلوں کے ساتھ جاتے تھے تجارت کے لیے
دور کے ملکوں کے پھر قصے سناتے تھے ہمیں
ایک بار ان سے سنا تھا اک مکاں کا تذکرہ
حوض، فوارہ، کبوتر
جالیاں، دیوار و در،
ہو بہو نقشہ تمہارے خواب کا
وہ بخارا کی گلی تھی جس میں تھا ایسا مکاں
جس کی دیواریں گلابی اور نیلی جالیاں۔"

(سہیل احمد خان، ڈاکٹر، راہ کی نشانیاں، لاہور: قوسین، ۲۰۰۱ء، ص ۳۸)

....

جاپان میں مہاجر پرندوں سے ملاقات

"ارے، یہاں بھی۔"
میں نے جھیل کے پانیوں میں سورج کی ترچھی کرنوں کو دیکھا تھا
تبھی اچانک اس آئنے میں تمہاری پرچھائیں تھرتھرائی
جو مڑ کے دیکھا تو تم اِدھر جھیل کے کنارے اُتر رہے تھے
مرے لبوں پہ تھی مسکراہٹ
کہ جیسے پردیس میں اچانک کسی شناسا کو دیکھ کر کوئی مسکرائے
ہلائے بازو
تمہیں بلایا
تم اپنی ازلی مسافرت میں اُسی طرح گم
"ارے، کوئی بات چیت بھی ہو۔"
میں اک ادارے کے ساتھ اپنے معاہدے کے چمکتے کاغذ پہ دستخط کر کے اس جگہ ہوں
مجھے خوشی ہے کہ اپنی ہستی کے عہدنامے کی پاس داری کو تم یہاں ہو
(سہیل احمد خان، ڈاکٹر، راہ کی نشانیاں، لاہور: قوسین، ۲۰۰۱ء، ص ۷۳)

....

ڈاکٹر سہیل احمد خان کی شاعری میں روایت اور جدت کا حسین سنگم ہے۔ وہ ہجر و وصال کے قصے بھی بیان کرتے ہیں اور مہاجرت کے عذاب کا رونا بھی روتے ہیں۔ وہ عشق کی سرمستیوں کا ذکر بھی کرتے ہیں اور اپنی بے بضاعتی کا شکوہ بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنے کھوئے ہوئے خواب کی تلاش میں سرگرداں بھی دکھائی دیتے ہیں اور وطن میں اپنی تلاش میں متحرک بھی نظر آتے ہیں لیکن ان تمام روایتی موضوعات کو وہ اتنے منفرد انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ان کی شاعری تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوتی ہے۔ ان کی شاعری نہ تو منیر

نیازی کی طرح ہمیں کسی طلسماتی دنیا میں لے جاتی ہے اور نہ مجید امجد کی طرح محض فطرت کا اسیر کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ان کی شاعری امکانی صداقتوں سے اُبھرتی ہے اور انتہائی سلاست سے ہمارے دلوں پر دستک دیتی ہے۔ آپ ان کی نظم ''شام کا تارا'' ملاحظہ فرمایئے اور لطف اٹھایئے۔

شام کے تارے سے اکثر پوچھتا ہوں
کچھ بتا
اے عاشقوں کے رازداں
اے شاعروں کے ترجماں
اے آسماں کی سمت تکتے
رہرووں کے آئنے
عاشق بنوں
شاعر بنوں
یا آسماں کی سمت تکتا راہ رَو

(سہیل احمد خان،ڈاکٹر، راہ کی نشانیاں، لاہور:قوسین، ۲۰۰۱ء، ص ۳۶)

....

ڈاکٹر سہیل احمد خان نے ایک طویل عرصے تک رسالہ 'محراب' کی ادارت کی۔ اس زمانے میں انہوں نے معروف تخلیق کاروں کے ساتھ ساتھ نوآموز تخلیق کاروں کی بھی حوصلہ افزائی فرمائی۔ انہوں نے اس رسالے کے ذریعہ نئے علمی مباحث کا آغاز کیا۔ انہوں نے مقبول اور معتبر کتابوں سے متعارف کرانے کا سلسلہ شروع کیا۔ انہوں نے شعوری کوشش کی کہ شعروادب کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ کے دیگر شعبوں کو بھی متعارف کرایا جائے۔انہوں نے بین الاقوامی ادب کے معتبر شہ پاروں کے تراجم بھی اس رسالے میں شائع کرانے کا خاص اہتمام کیا۔ڈاکٹر سہیل احمد خان کی یہ مدیرانہ کاوشیں ثمر بار ہوئیں او

ان کے رسالے 'محراب' کے وسیلے سے علم و ادب کو فروغ دینے والے تخلیق کار آج کل علمی و ادبی دنیا میں سرگرم عمل ہیں۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان علم و دانش کے کوہسار تھے۔ دانش وری ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ حسن عسکری اور سجاد باقر رضوی سے علمی تمسک کے باعث ان کے اندر ایسی بصیرت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ چیزوں کو دانشورانہ سطح پر جانچتے اور پرکھتے تھے۔ حلقہ ارباب ذوق کے بھرپور اجلاس ہوں یا علمی و ادبی سیمینارز، شہر کی ادبی تقاریب ہوں یا درسگاہوں میں لیکچر سہیل احمد خاں ہر جگہ دانشورانہ سطح پر گفتگو کرتے تھے۔ موضوع کو نئے تناظر میں دیکھنا اور ان پر بے لاگ محاکمہ کرنا ڈاکٹر سہیل احمد خان کا خاصہ تھا۔ وہ نئے موضوعات تلاش کرتے تھے اور ہر موضوع پر سیر حاصل گفتگو فرماتے تھے۔ ان کی یہ دانشورانہ صلاحیت ان کی بے پناہ علمی قابلیت، ترقی پسندانہ فکر اور اصابت رائے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان ایک بہترین منتظم بھی تھے۔ اورینٹل کالج لاہور میں وہ شعبۂ اردو کے چیئرمین رہے اور بعد میں اسی کالج کے پرنسپل بھی بنے۔ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو جائیں ان کے ماتحت ان سے خوفزدہ اور حکام بالا نالاں رہتے ہیں تاہم ڈاکٹر سہیل احمد خان کا مسئلہ بالکل مختلف رہا۔ ان کے ماتحت ان سے خوش اور حکام بالا مطمئن رہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے جنازے پر جہاں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے وائس چانسلر خالد آفتاب کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے وہاں اورینٹل کالج کے چپڑاسیوں کی آنکھیں بھی اشک بار تھیں۔ ان کا جسد خاکی دیکھ کر سب زبانِ حال سے یہی کہہ رہے تھے۔

کل جو اٹھتے تھے بٹھانے کے لیے
آج بیٹھے ہیں اٹھانے کے لیے

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ عصرِ حاضر میں قحط الرجال ہے اور ہر شعبۂ حیات روبہ زوال ہے۔ یہ صورت حال اس وقت مزید ابتر ہو جاتی ہے جب ڈاکٹر سہیل احمد خان جیسا صاحب فہم و فراست دنیا سے رخصت ہو جائے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان کو یاد کرنے کا بہترین طریق یہ ہے کہ ہم ان کی دانشورانہ روایت کی تقلید کریں اور ان کی جلائی ہوئی علمی و ادبی شمع کو اپنے خونِ جگر سے اور زیادہ فروزاں کریں۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان رجائی نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ وہ عالمِ بالا سے اپنے تمام محبین کو یہی پیغام دے رہے ہیں

جو ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا دوسرا ہو گا
ترے جہان میں قحط الرجال تھوڑی ہے

◆◆◆

◆◆◆

حفیظ تائب اور حبِّ محمدؐ وآلِ محمدؐ

◆◆

اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات انسان کو تخلیق کر کے دنیا میں بھیجا تو اس کی ہدایت کے لیے جلیل القدر ہستیوں کو بھی مبعوث فرمایا۔ یہ ہدایت یافتہ مطہر ہستیاں زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتی ہیں۔ یہ رضائے رب کے حصول کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتی ہیں اور ان کا جینا مرنا سب احکامِ الٰہی کا پابند ہوتا ہے۔ یہ ہستیاں کسی خاص قوم، وقت یا خطے کے لیے خلق نہیں کی جاتیں بلکہ ازل سے لے کر ابد تک ان کی حکمرانی ہوتی ہے۔ وہ عالمین کے لیے رحمت اور ہدایت کا سرچشمہ ہوتی ہیں۔ زمانے کی سرد اور گرم ہوائیں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں کہ ان کی نظرِ کرم سے موسموں کو تنوع حاصل ہوتا ہے اور زمانہ ان کی اجازت سے اپنی روش تبدیل کرتا ہے۔ انسان کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ ان معتبر اور متبرک ہستیوں کا عرفان نہیں کر پاتا اور اپنی کج فہمی کے باعث دریائے معصیت میں غوطہ زن رہتا ہے۔ حضرت **حفیظ تائب** وہ خوش بخت انسان ہیں جو حضرت سلمانؓ فارسی وابوذرؓ غفاری کی طرح محمدؐ و آلِ محمدؐ سے والہانہ محبت رکھتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ پنجتن کا غلام عالمین کا سردار بن جاتا ہے۔ ان احبابِ کرم کی مودت سے قلب کو تسکین اور نگاہوں کو نورِ ازلی وابدی حاصل ہو جاتا ہے

دل کو تسکین ہو گئی تائبؔ
جس گھڑی پنجتن کی یاد آئی

حفیظ تائب ایک پاک باطن اور نیک نفس انسان تھے۔ ان کی سیرت کے یہی اوصاف ان کی تخلیقات میں جلوہ گر ہیں۔ انہوں نے یوں تو ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی لیکن ان کے جوہر نعت و مناقب میں کھل کر ہمارے سامنے آئے۔ خاص طور پر جب وہ حضرت محمدؐ و آلِ محمدؐ کا ذکرِ جمیل کرتے ہیں تو ان کا قلم نور و نکہت کے خزانے اُگلنے لگتا ہے۔ وہ اہلبیتؑ کی صفات اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان کی سیرت کے تمام پہلو ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ان برگزیدہ ہستیوں کی تعلیمات کی روشنی میں اقوامِ دہر آج بھی ہدایت حاصل کر سکتی ہیں کہ ان کے فیوض و برکات کا سلسلہ ازل سے ابد تک جاری و ساری ہے۔

جس سے پائیں گی ہدایت تا ابد اقوامِ دہر
ایسی بے پایاں رسالت آپؐ کو بخشی گئی

زیست کا ہر شعبہ جس سے نور پائے گا سدا
وہ سراپا حسنِ سیرت آپؐ کو بخشی گئی

جو پہنچتی ہی رہے گی سب عوالم تک مدام
ایسی لامحدود رحمت آپؐ کو بخشی گئی

آپ ہی کے فیض سے ساری زمیں ہے سجدہ گاہ
ایسی عالم گیر وسعت آپؐ کو بخشی گئی

بعدِ محشر بھی نہ آئے گا جسے تائبؔ زوال
ایسی شانِ بے نہایت آپؐ کو بخشی گئی

حضرت حفیظ تائب اہلِ بیت کو رسولِ اکرمؐ کا عکسِ جمیل اور پرتوِ شانِ الٰہی سمجھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جب وہ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہٗ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا اور حسنین کریمین کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا دل مودت سے سرشار اور آنکھیں جوشِ عقیدت سے

نمناک ہو جاتی ہیں۔ وہ حضرت علی علیہ السلام کو شاہِ خیبر شکن، پیشوائے زمن، جاں نثار رسولؐ، زوجِ بتولؓ، شیرِ حق، گل افشانِ دہن، دستِ شمشیر زن، بوترابی چلن، حکمتوں کے چمن، مظہرِ شان وشکوہِ مصطفےٰ، ضیغمِ حق، پیکر فقر وغنا، آسمانِ اتقا، قائدِ ایوانِ تسلیم ورضا، نیرِ برجِ ولا، ہارونِ خیر الانبیاء، مردِ میدانِ وغا، ماہِ حکمت، مدبر کی صدا، شارحِ اُم الکتاب، شانِ منبر، خطیبِ خوشنوا اور چراغِ صفا قرار دیتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے رسولِ اکرمؐ کی سیرت پر ہو بہو عمل کیا اور ہدایت کے راستوں کو اور زیادہ کشادہ کیا۔ انہوں نے ہر دور میں مصیبت کے ماروں کی مشکل کشائی کی اور اپنے خطبات اور خطوط سے رہنما اصول مرتب کیے۔

وا کیے جس نے سینکڑوں عقدے
اس گُل افشاں دہن کی یاد آئی
مسئلے جب اُمڈ اُمڈ آئے
بوترابی چلن کی یاد آئی
جب جہالت کے دشت میں بھٹکے
حکمتوں کے چمن کی یاد آئی

حفیظ تائب حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہ سے بے پایاں عقیدت رکھتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اگر آج بھی اُمتِ مسلمہ حضرت علیؓ کی سیرت و کردار کو اپنا لے تو وہ دین و دنیا میں سرخرو ہو سکتی ہے۔

قابلِ تقلید کردار ان کا صلح و جنگ میں
گویا ہر میداں میں ٹھہرے رہنما مولیٰ علیؓ

آپ ان کی درج ذیل منقبت ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ حفیظ تائب حضرت علی کرم اللہ وجہ سے کیسی انسیت رکھتے ہیں۔

نیرِ عظمت کردار جنابِ حیدرؓ
سربسر مطلعِ انوار جنابِ حیدرؓ

قریۂ علم کے در، تاج رسالت کے گہر
معرفت کے یمِ زخار، جناب حیدرؑ
بزم میں موجۂ نکہت کی طرح نرم و گداز
رزم میں صورتِ کہسار جنابِ حیدرؑ
ایک آئینۂ انوار بچشم ایماں
ایک گنجینۂ اسرار جنابِ حیدرؑ

حضرت حفیظ تائب حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں اور بارگاہِ فاطمہؑ پر ان کا سر اور قلم دونوں خم ہو جاتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ حضرت فاطمہؑ بیٹی، بیوی اور ماں ہر روپ میں وجہِ افتخار ہیں۔ وہ لختِ جگر سرورِ دیںؐ، خانۂ حیدرؑ میں عفت و عصمت کی روشنی اور والدہ شبیرؑ و شبرؑ ہیں۔ انہوں نے اپنی سیرت و کردار سے عالمین کی نسواں کے لیے ایک راہِ عمل متعین کر دی ہے اور آج وہ غیرتِ نسواں کی علامت بن چکی ہیں۔ وہ ایک جانب تو آخرت میں خاتونِ جنت ہیں اور دوسری جانب دنیا میں علم و حلم و عفت و عصمت کا نمونۂ اولین و آخرین ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی سیرت و کردار اپنا کر خواتین آج بھی اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتی ہیں۔ حفیظ تائب کی درج ذیل منقبت کا عمیق نگاہی سے مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ انہوں نے جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا سے اپنی ارادت کا اظہار کس طرح کیا ہے۔

لختِ جگر سرورِ دیں سیدۂ پاک
شہ بانوئے فردوسِ بریں سیدۂ پاک
وہ جس کی حیا روشنیٔ خانۂ حیدرؑ
وہ شمعِ حرم، پردہ نشیں سیدۂ پاک
عفت کا نشانِ ازلی حضرتِ زہراؑ
ایثار کا معیارِ حسیں سیدۂ پاک

وہ جس کے جگر بند بنے دیں کے محافظ
وہ آبروئے دینِ متیں سیدۂ پاکؑ
وہ جس کی ردا غیرتِ نسواں کی علامت
ناموسِ رسالتؐ کی امیں سیدۂ پاکؑ

حضرت حفیظ تائب جوانانِ جنت کے سرداروں حسنینؑ کریمین حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ ان کا مؤقف یہ ہے کہ یہ دونوں شخصیات مہر و ماہ کی طرح آسمانِ دین و دنیا کو پاکیزہ روشنی عطا کرنے کا موجب ہیں۔ ان کا مؤقف یہ ہے کہ حضرت امام حسنؑ شبیہ رسولؐ ہیں لہٰذا ان کی صلح و جنگ کو کردار ختمی المرتبت کی روشنی میں پرکھنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے امن و امان اور سکون و سلامتی کے لیے دنیا کے تاج و تخت کو ٹھکرا کر اپنے جلیل القدر ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ یہی سبب ہے کہ آج پوری دنیا حضرت امام حسنؑ کے نقشِ قدم پر چلنا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتی ہے۔ آپ حفیظ تائب کی درج ذیل منقبت کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ وہ حضرت امام حسن علیہ السلام کی شخصیت کے کن کن گوشوں کو اپنے افکار جلیلہ سے تاباں کر رہے ہیں۔

مروّت کا بانی حسنؑ ابنِ حیدرؑ
بہارِ معانی حسنؑ ابنِ حیدرؑ
خلافت کی مسند پہ امن چھوڑی
ہوا غیر فانی حسنؑ ابنِ حیدرؑ
جوانانِ جنت کا سردار ہوگا
وہ زہراؑ کا جانی حسنؑ ابنِ حیدرؑ
رسولِؐ امیں کی شبیہ مبارک
نبیؐ کی نشانی حسنؑ ابنِ حیدرؑ

نہ دیکھے گی چشمِ فلک تا قیامت
کبھی جس کا ثانی حسن ابنِ حیدرؑ

حضرت حفیظ تائب سید الشہدا حضرت امام حسینؑ کی سیرت و کردار

سے بے حد متاثر ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اقوامِ عالم ان کے کردار کی روشنی سے اپنے در و بام کو آج بھی جگمگا سکتی ہیں۔ حفیظ تائب نے امام عالی مقام کو ماہِ مطلعِ ارشاد، حق آشنا، شہادت مآب، رحمت زاد، مشہدِ تسلیم کا جلال و جمال، چمن طراز، صبا مژدہ، بہار ایجاد، حریت آموز، زندگی افروز، امامِ عصر، سفیرِ بقا، امیرِ معاد، سروخو، سپہرِ وقار، ماہ رو، گلاب نہاد، سیدِ شبابِ جنت الفردوس، قاطعِ طلسمِ استبداد، بہارِ فکر و نظر، برگِ صبر، بارِ رضا، نخلِ مراد، روحِ جہاد، جانِ ثبات، نورِ حمیت، ہلالِ صبر، نغمۂ جاں، پیکرِ وفا، مہ لقا، آئینۂ ضمیر نما، بہارِ بقائے دوام، وقارِ قعود و قیام، بابِ استقلال، سرمایۂ ثبات، رضائے حق کا جوئندہ، رہنمائے نسلِ آئندہ، حق پرستوں کا نمائندہ، شاہانِ ذوالفقار، نازشِ بہار، عزم و استقلال کا پیکر، نظم و ضبط و شکر کا خوگر، بطلِ جلیل، کاروانِ عشق کا رہبر، بہارِ باغِ پیغمبرؐ، گل بدن، گل پیرہن، گل رو، گل افشاں، گل بدوش، مہِ انور، آبروئے عاشقاں، افتخارِ فاتحِ خیبر، نیرِ اعظم، تصویرِ عزم، پیکرِ صبر و رضا، توقیرِ عشق، چہرۂ عشق کی ضیا، شمعِ رہ ہدیٰ، شہِ گل گوں قبا، پورِ بتولؑ، وارثِ شیرِ خدا اور نورِ نگاہِ حضرت خیر الوریٰ قرار دیا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ کرب و بلا کے میدان میں امامِ عالی مقامؑ نے دین کی سربلندی اور انسانیت کی سرافرازی کے لیے اپنی قیمتی جان کا نذرانہ پیش کیا تھا لہٰذا اب ہمیں چاہیے کہ ہم ان کی محبت میں عظمتِ انسانی کے لیے تگ و دو کریں تا کہ معاشرے کی مخربِ اخلاق قدریں مٹ جائیں اور سچائی، امن اور بھائی چارے کی فضا پیدا ہو جائے۔

تیری محبت کا ہے تقاضا
کرتے رہیں تقلید تری ہم
عزت دیں پہ مرنا سیکھیں
ہم سے فزوں ہو عظمتِ آدم

ظلمتِ شر یکسر مٹ جائے
خیر کی قدریں ہوں مستحکم

حفیظ تائب کرب و بلا میں امام حسینؑ کی قربانی کو ایک سانحہ نہیں سمجھتے بلکہ ان کے نزدیک یہ واقعہ عزم و عمل کا ایک تابندہ استعارہ ہے۔ وہ احساس دلاتے ہیں کہ ہم امام عالی مقامؑ کے پاکیزہ لہو کی روشنی سے اپنے اپنے وجود کو نورانی بنا سکتے ہیں اور واقعۂ کربلا کے فیوض و برکات سے کشمیر اور بوسنیا کو حقیقی آزادی دلا سکتے ہیں کہ امام حسینؑ حق پرستوں کے نمائندہ اور رہنمائے نسلِ آئندہ ہیں۔

زمزمۂ جہاد سے سینوں میں بجلیاں بھرو
توڑو مفاد کے صنم، خونِ حسینؑ کی قسم
اُبھرے گا مہرِ حریت، وادیٔ کاشمیر میں
کٹ کے رہے گی شامِ غم خونِ حسینؑ کی قسم
بوسنیائی بھائیو دور نہیں ہے صبحِ نور
مٹ کے رہے گا ہر ستم خونِ حسینؑ کی قسم
اہلِ حرم کے اشکِ غم لائیں گے رنگ ایک روز
خونِ حسینؑ کی قسم، خونِ حسینؑ کی قسم

حفیظ تائب امام حسین علیہ اسلام کی قائدانہ صلاحیتوں کے معترف ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ آج معاشرے میں جو حق اور سچ کہنے کا حوصلہ موجود ہے یہ فقط عنایت شبیرؑ ہے۔

یہ حوصلہ بھی ہے تائب عنایتِ شبیرؑ
جو حرفِ حق میں سرِ بزمِ عام کہتا ہوں

حفیظ تائب ان جاں نثارانِ کربلا کو بھی سلام پیش کرتے ہیں جنہوں نے اسلام کی سربلندی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ وہ سبطِ پیغمبر کی فوج میں شامل ہر وفا شعار بطور خاص حضرت

سید سجادؑ بیمار کربلا، حضرت عباسؑ علمبردار، حضرت علی اصغرؑ طفلِ شیر خوار اور کربلا کی شیر دل بنات رسولؐ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ وہ آنکھ جو یادِ امام میں اشکبار اور وہ دل جو یادِ حسینؑ میں سوگوار ہے ان پر بھی ہمارا سلام واجب ہے۔ دراصل حفیظ تائب امام عالی مقام کو صراطِ مستقیم اور راہِ نجات تصور کرتے ہیں۔ آپ ان کا درج ذیل سلام ملاحظہ فرمایئے اور امام عالی مقامؑ سے ان کی والہانہ عقیدت کے مناظر دیکھیے۔

چرچا ہے جہاں میں تری تسلیم و رضا کا
زیبا ہے لقب تجھ کو امامِ شہدا کا
نازِ بشریت ہے ترا سجدۂ آخر
رُخ پھیر دیا جس نے زمانے کی ہوا کا
نذرانۂ جاں پیش کیا دین کی خاطر
تو باب نیا کھول گیا صدق و صفا کا
ہر عہد میں خوشبو ہے تری موجِ نفس کی
ہر عصر میں جلوہ ہے ترے رنگِ قبا کا
حق گوئی و ثابت قدمی تیری مثالی
خوں تیری رگوں میں تھا رواں شیرِ خداؑ کا
دنیا میں جدا ہے ترا اندازِ شہادت
جاں دینا تھا گو شیوہ سدا اہلِ وفا کا
جس شام کئی چاند تھے کربل کی زمیں پر
اُترا ہوا کیوں چہرہ تھا کوفے کی فضا کا
کیا بات ترے فرقِ شفق رنگ کی مولا
کیا کہنا ہے تیرے لبِ قرآن سرا کا

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے محمدؐ و آلِ محمدؐ کو خلق کیا اور انہوں نے اپنے طرزِ عمل اور فکر و نظر کے ذریعہ پوری کائنات کو صراطِ مستقیم عطا کی۔ یہی سبب ہے کہ اہلبیتِ محمدؐ سے محبت ہمارے لیے باعثِ صد افتخار و موجبِ طمانیت ہے۔ حضرت حفیظ تائب بھی اہلبیت سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور انہوں نے اپنے حرف و لفظ کی حرمت کو بحال رکھنے کے لیے محمدؐ و آلِ محمدؐ کو اپنے اشعار کا مرکز و محور بنایا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے اشعار یاقوت و زمرد کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ اب یہ بات بلا شک و بلا تردد کہی جا سکتی ہے کہ جب تک اس فنا پذیر دنیا میں محمدؐ و آلِ محمدؐ کا ذکرِ جمیل ہوتا رہے گا، حضرت حفیظ تائب کے اشعار اپنی روشنی بکھیرتے رہیں گے اور ان کا یہ منشورِ حیات ہمارے موقف کی تائید کرتا رہے گا۔

انہی کے در کو سمجھتا ہوں بابِ استقلال
انہی کے گھر کو میں دارالسلام کہتا ہوں
یہ انتساب ہے سرمایۂ ثبات مرا
کہ خود کو آلِ نبیؐ کا غلام کہتا ہوں

◆◆◆

ڈاکٹر سلیم اختر۔ ایک تہذیبی خاکہ نگار

ہم ایک ایسے پرآشوب دور سے گزر رہے ہیں جہاں اپنے وجود کو قائم رکھنا دشوار سے دشوار تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ انسان کی ذات چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ہر حصہ دوسرے سے لاتعلق محسوس ہوتا ہے۔ جس طرح ایک ٹوٹا ہوا آئینہ انسانی چہرے کو مختلف خانوں میں منقسم کر دیتا ہے اور انسان خود اپنی شناخت سے محروم رہ جاتا ہے اسی طرح آج کا تخلیق کار بھی اپنے بکھرے ہوئے خدوخال اور حسین یادوں کو مجتمع کرنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔ جب وہ ماضی کا ''درشن جھروکہ'' کھولتا ہے تو اسے اپنی شخصیت کے خدوخال اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایک ایک کر کے اپنے ماضی کے نقوش کو جمع کرتا ہے اور اپنے منتشر وجود کو مکمل کر لیتا ہے۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ ایک زیرک تخلیق کار ''درشن جھروکہ'' کے ذریعہ محض اپنے عہد کے نامور اور ممتاز احباب کو متعارف ہی نہیں کراتا بلکہ اپنی بکھری ہوئی زندگی کو یکجا کر کے قارئین کی نذر کر دیتا ہے۔ بقول شاعر

تلاشِ منزلِ جاناں تو اک بہانہ تھا
اسی بہانے میں خود کی طرف روانہ تھا

انسان ماضی پرست حیوان ہے۔ ماضی کی حسین یادیں اور دلکش باتیں

ہمیشہ اس کے لیے قیمتی سرمایا ہوتی ہیں۔ اس کشاکش اور پُرفتن زندگی میں اسے جب بھی فرصت کے چند لمحات میسر آجائیں تو وہ ماضی کا جھروکہ کھول کر صبائے تسکین بخش سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔ وہ بعض اوقات تو حال اور مستقبل سے یکسر غافل ہو کر ماضی میں پناہ لے لیتا ہے۔ ماضی کی آغوش میں جا کر اس کے لیے تسکین کے کئی گوشے وا ہو جاتے ہیں۔ حال سے ماضی میں جانا ایک تخلیقی عمل ہے کہ اس صورت میں تخلیق کار ماضی کو حال میں کھینچ لانے کی مشکور سعی کرتا ہے۔ **ڈاکٹر سلیم اختر** بھی ایک ایسے ہی تخلیق کار ہیں جو یادوں کے دریچے کے ذریعہ ماضی میں داخل ہوتے ہیں اور وہاں سے یادوں کے قیمتی جواہرات کو ''درشن جھروکہ'' کے ذریعہ ہمارے سپرد کر کے مستقبل کی منصوبہ سازی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہم ''درشن جھروکہ'' ہاتھ میں لے کر ماضی میں چلے جاتے ہیں اور پھر وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

یادِ ماضی میں کچھ ایسا کھو گئے
مڑ کے دیکھا اور پتھر ہو گئے

''**درشن جھروکہ** ''ڈاکٹر سلیم اختر کے تخلیق کردہ خاکوں کا اولین مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں انہوں نے اپنے عہد کی اڑتیں بلند قامت شخصیات پر خامہ فرسائی کی ہے تاہم اپنے ممدوحین کا خاکہ اڑانے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے حتی الوسع دوستوں کو سنبھال کر رکھنے کی کوشش کی ہے کسی کو ضائع نہیں ہونے دیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اس مجموعے میں اپنے عہد کو بھی محفوظ کیا اور عہد ساز شخصیات کو بھی۔ تاہم لطف کی بات یہ ہے کہ وہ بھی ان خاکوں کی بدولت ''محفوظ'' ہوتے چلے گئے ہیں۔ سب سے پہلے ان کے تحریر کردہ ''پیش لفظ'' کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے جو ہمارے موقف کی ترجمانی کر رہا ہے:

''خاکہ نگاری کے دوران، غیر شعوری طور پر خاکہ نگار بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر بین السطور میں اپنا خاکہ بھی قلم بند کر جاتا ہے، یوں

خاکہ میں ''میں'' کی رنگ آمیزی بھی ہو جاتی ہے۔ گلوں میں یوں رنگ بھرنا اچھا ہے یا برا، اس کا انحصار ذاتی سوچ پر ہوگا۔ دراصل خاکہ نگار کی شخصیت کے عناصر ترکیبی کے ساتھ ساتھ سوچ، زاویہ نگاہ اور پسند ناپسند کا معیار بحیثیت مجموعی اس غیر مرئی ''عینک'' کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جس سے موضوع بننے والی شخصیت، دوست، فرد کو ''دیکھا'' جاتا ہے۔ یہ وہ غیر شعوری عمل ہے جس کی بنا پر اپنی ذات و صفات کو (بالواسطہ غیر شعوری طور پر) دوسروں میں بھی تلاش یا اجاگر کیا جاتا ہے۔

''خاکہ میں ''میں'' تو ہوتی ہے لیکن ''میں'' کو ہنڈیا میں نمک کی مانند ہونا چاہیے۔ نمک کے بنا سالن کسی کو نہ بھائے۔ سوانح عمری شخص اور شخصیت کی زیست پر مبنی طرح طرح کی ڈشوں سے سجا دسترخوان ہے تو خاکہ اس کے مقابلہ میں سنگل ڈش ہے، لہٰذا اسے ہر ممکن طریقہ سے لذیذ بنانا چاہیے۔ خاکہ زندگی کا مکمل منظر نامہ نہیں بلکہ یہ تو صرف ایک جھلک کے مترادف ہے۔ فوٹوگرافی کی اصطلاح میں اسے کلوز اپ یا پروفائل سے مشابہہ قرار دیا جا سکتا ہے جس طرح ہر اچھا فوٹوگرافر روشنی اور سایہ کے امتزاج کے ساتھ ساتھ لینز کے زاویہ پر بھی دھیان دیتا ہے اسی طرح خاکہ نگار کو بھی یہ علم ہونا چاہیے کہ اسے کتنی روشنی کی ضرورت ہے، نیز شخصیت پر یہ روشنی کس زاویہ سے ڈالی جائے۔ سوانح عمری بڑی حویلی ہے تو خاکہ صرف ایک جھروکہ۔ یوں خاکہ نگاری درشن جھروکہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔''

(سلیم اختر، ڈاکٹر، درشن جھروکے، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۸)

"دریچہ جھروکہ" میں درج ذیل احباب کے خاکے شامل ہیں:

۱۔ گلبدن (حسرت موہانی)

۲۔ حضور! عدم آیا ہے (سید عبدالحمید عدم)

۳۔ خالی بوتل کا المیہ (میرزا ادیب)

۴۔ مصورِ مشرق چغتائی (عبدالرحمٰن چغتائی)

۵۔ داستان سرائے کا داستان گو (اشفاق احمد)

۶۔ آزاد مرد (جگن ناتھ آزاد)

۷۔ مشفق خواجہ

۸۔ سلیم احمد کے دفاع میں

۹۔ استادِ محترم ڈاکٹر سید صفدر حسین

۱۰۔ دلدار ہے قتیل (قتیل شفائی)

۱۱۔ گرم دمِ جستجو (محمد طفیل۔ نقوش)

۱۲۔ صدقِ خلیل (خلیل صدیقی)

۱۳۔ دوستی کا گل سر سبز (عبدالوہاب خاں سلیم)

۱۴۔ رام لعل اور لاہور

۱۵۔ To Sir With Love (ڈاکٹر آغا سہیل)

۱۶۔ تاج سعید : شخصِ ہفت رنگ

۱۷۔ پُر جوش (اے جی جوش)

۱۸۔ ہیرو (اے بی۔ اشرف)

۱۹۔ گرم لہو کی دھمال (ڈاکٹر طاہر تونسوی)

۲۰۔ ڈارک آئس برگ (ستار طاہر)

۲۱۔ پیا (ڈاکٹر معراج نیر زیدی)
۲۲۔ فن کے صحرا میں آبلہ پا (محسن نقوی)
۲۳۔ شہزادہ (منیر احمد شیخ)
۲۴۔ نخلستان (اختر انصاری اکبرآبادی)
۲۵۔ کچھ صابر دت کے بارے میں
۲۶۔ ابن حنیف: شخص تنہا تنہا سا
۲۷۔ فہیم اعظمی
۲۸۔ احمد ندیم قاسمی......سب اچھا کہیں جسے
۲۹۔ حریت فکر کا داعی: احمد ندیم قاسمی
۳۰۔ احمد ندیم قاسمی: تخلیقی شخصیت
۳۱۔ احمد ندیم قاسمی......الوداع!
۳۲۔ فیض احمد فیض
۳۳۔ حفیظ جالندھری
۳۴۔ قدرت اللہ شہاب
۳۵۔ عرش صدیقی / فارغ بخاری
۳۶۔ جابر علی سیّد
۳۷۔ پروفیسر محمد عثمان
۳۸۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
۳۹۔ دلیپ سنگھ
۴۰۔ ڈاکٹر آغا سہیل

دانش مندوں کے نزدیک عظیم تخلیق کار کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ اپنی

تحریروں میں ماضی و مستقبل کی نسبت حال کو زیادہ محفوظ کرنے کی سعی کرتا ہے۔ جس طرح میر و غالب نے اپنے عہد کی زوال آمادہ تہذیبوں کو اپنی شاعری میں محفوظ کرنے کی کاوش کی، بالکل اسی طرح ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی ''درشن جھروکہ'' میں اپنے عہد کی زبوں حال تہذیب کے دلکش مرقعوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے زمانے کی صورتِ حال کو محفوظ کرنا ایک مشکل کام ہے۔ اس کے لیے بلند حوصلگی، عالی ظرفی اور دور شناسی درکار ہوتی ہے اور ڈاکٹر سلیم اختر ان تینوں اوصاف سے مالا مال ہیں۔ انہوں نے ''درشن جھروکہ'' میں اپنے عہد کے محاسن و عیوب پر کماحقہ روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے زمانے کی نزاکتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف اپنی دستار ہی نہیں سنبھالی ہے بلکہ اچھے بُرے حالات و واقعات کے رونما ہونے والے اثرات کو بھی بیان کیا ہے۔ وہ اپنے عہد کے حالات میں کبیدہ خاطر بھی ہیں اور دل برداشتہ بھی لیکن رجائیت کی موہوم امید انہیں معاشرے میں زندہ رہنے کا عزم و حوصلہ عطا کرتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی محلِ نظر رہے کہ معاشرے کی چیرہ دستیوں کو بیان کرتے ہوئے ان کا اسلوب تند اور لب و لہجہ ترش ہو جاتا ہے۔ وہ معاشرتی برائیوں اور اخلاقی خرابیوں کی بیخ کنی کے لیے طنز کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ آپ ''درشن جھروکہ'' کے مختلف خاکوں کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ انہوں نے ہمارے سماج کو کس طرح موضوع بنایا ہے:

> ''......میں تصور کرتا ہوں کہ مولانا حسرت موہانی ۱۹۴۷ء میں مسلم لیگی لیڈروں کی مانند پاکستان میں آ کر آباد تو ہو جاتے ہیں لیکن اپنی حق پسند طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر نہ تو کوٹھیاں الاٹ کراتے ہیں اور نہ ہی روٹ پرمٹ لیتے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اپنی مفاہمت نا آشنا طبیعت اور صداقت آشنا زبان کے ہاتھوں عہدِ غلامی کی مانند وہ آزاد پاکستان میں بھی تنگ ہی رہتے ہیں۔ بالآخر مسلم لیگ کی حکومت ان کی جھینگروں جیسی آواز کی سمع خراشی سے اتنی تنگ آ جاتی ہے کہ ایک سہانی صبح وہ خود

کو شاہی قلعہ میں پاتے ہیں۔ ساٹھ فٹ اونچی دیواروں والے زندان میں ان سے جو حسنِ سلوک کیا جاتا کیا وہ ''واپسی'' پر (اگر وہ ممکن ہوتی) بقائمی ہوش وحواس نئے ''مشاہداتِ زنداں'' رقم کرنے کے قابل رہ سکتے تھے؟''

(سلیم اختر، ڈاکٹر، ورثن جھروکے، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵)

....

''پونہ میں بیشتر کاروبار عورتوں کے ہاتھ میں تھا، بلکہ چھوٹی موٹی دوکانیں تک بھی عورتیں ہی کرتی تھیں۔ چنانچہ مارکیٹ میں سبزی بیچنے والی تمام عورتیں ہی تھیں۔ شاید یہ پڑھ کر بڑا رومینٹک محسوس ہو کہ عورتیں سودا بیچتی تھیں اور مرد خریدتے تھے۔ گویا ایک طرح کا مینا بازار ہو گیا لیکن مرہٹی عورت اور بالخصوص نچلے طبقہ کی ''دھیڑ'' عورتیں کوئی ایسی خوبصورت نہ ہوتی تھیں۔ چھوٹے قد، گھٹے ہوئے دوہرے جسم اور پکے رنگ، بہت چھوٹا بلاؤز پہنتیں جو کمر پر صرف ایک ڈوری سے بندھا ہوتا۔ ساڑھی کا ایک پلو پیچھے کمر میں یوں کس کر لٹکا لیتیں کہ اگر آج کوئی ویسی ساڑھی پہن کر قصہ خوانی سے گزر جائے تو ہاں مل ڈک لیں۔ بہر حال کاروبار عورتوں کے ہاتھ میں تھا اور مجھے یاد ہے کہ مارکیٹ کی سب سے جوان اور خوبصورت عورت سے سبزی خریدی جاتی تھی۔''

(سلیم اختر، ڈاکٹر، حضورِ عدم آیا ہے، ص ۳۰)

....

''اشفاق احمد بنیادی طور پر مصلح تھے اسی لیے وہ پاکستانیوں کو عملِ خیر کی تلقین کرتے رہتے تھے، ان پاکستانیوں کو جن کے لیے عملِ غیر شرعی عملِ خیر ثابت ہوا کرتا ہے۔ اشفاق احمد بنیادی طور پر بے حد مذہبی تھے

مگر مذہب کو انہوں نے صوفیا کی تعلیمات کے توسط سے حاصل کیا۔ اسی لیے مُلّا کی پسندیدگی کے باوجود خود وہ مُلّا بنا اور نہ ہی مُلائیت پرمبنی بنیاد پرستی کو شعارِ زیست بنایا۔"

(سلیم اختر، ڈاکٹر، داستان سرائے کا داستان گو، ص ۴۳)

....

"علامہ اقبالؔ کے کلام کو آج جو شاعری سے ماورا کچھ اور ہی سمجھا جا رہا ہے تو اس کی بنیادی وجہ علامہ اقبالؔ کا تصور پاکستان کا خالق ہونا ہے۔ علامہ اقبال نے کیونکہ قرآن مجید سے فیض حاصل کیا، اس لیے علامہ اقبالؔ کے نظام فلسفہ کے کسی پہلو پر تنقید کا مطلب تصورِ پاکستان یا اسلام کی مخالفت کے مترادف قرار پاتا ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ اس تصور کے فروغ میں وہی طبقہ پیش پیش نظر آتا ہے جو زندگی بھر علامہ اقبال کا مخالف رہا اور علامہ نے جس کا ہمیشہ مذمتی اسلوب میں ذکر کیا لیکن آج وہی وارثِ اقبالؔ نظر آتے ہیں اور ان ہی کی بنا پر علامہ اقبالؔ کو ہر نوع کے تنقیدی پیمانوں سے ماورا سمجھ لیا گیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں کالج نوٹس قسم کے مضامین نے اقبالیات کو اشعار اور حوالوں اور خیالات کی تکرار کی دلدل میں تبدیل کر دیا ہے۔"

(سلیم اختر، ڈاکٹر، سلیم احمد کے دفاع میں، ص ۷۷)

....

"میں نقاد ہوں اور مجھے علم ہے کہ کتابوں کی تقاریب کس طرح بصورت دعوت ولیمہ کرائی جاتی ہیں۔ دیباچے اور فلیپ لکھوانے کے لیے کیا کیا جتن کیے جاتے ہیں اور اخباروں میں توصیفی کالم اور تصویر چھپوانے کے لیے کس طرح سے پاپڑ بیلے جاتے ہیں۔"

(سلیم اختر، ڈاکٹر، صدق خلیل، ص ۱۰۳)

''فرد کی مانند شہر کا بھی اپنا ایک مزاج اور افتادِ طبع ہوتی ہے جس طرح چہروں کی بھیڑ میں اچانک ایک ایسا چہرہ نظر آ جاتا ہے جو آنکھوں میں روشنی بن کر اُتر جاتا ہے اسی طرح لاتعداد شہر گھومنے کے بعد ایک ایسے شہر سے بھی تعارف ہو جاتا ہے جو اپنی الگ بُو باس رکھتا ہے اور لاہور یقیناً ایسا ہی شہر ہے کہ بُتِ طناز کی مانند باز وکھول کر ملتا ہے لیکن اس کے باوجود اپنا فاصلہ بھی برقرار رکھتا ہے۔ اس کے وصل میں بھی فراق کی کسک ملتی ہے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ لاہور کی نفسیات کیا ہے تو میں اسے صرف ایک لفظ ''نرگسیت'' سے واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہاں کے ادیب، فنکار، اداکار، گلوکار، صحافی اور بہت سے دوسرے جیسے سری پائے بیچنے والے، پنواڑی، مالشیے، جیب کترے، اٹھائی گیرے، طوائفیں اور گشتیاں دراصل وہ مختلف آئینے ہیں جن میں یہ نرگسی شہر اپنے جمال کا مختلف زاویوں سے نظارہ کرتا ہے۔ چنانچہ یہ اور اس نوع کے دیگر آئینے مل کر اس شیش محل کی تشکیل کرتے ہیں جو طلسمی داستانوں کے پراسرار محل کی مانند راہ چلتوں کو اپنی محبت میں اسیر کر لیتا تھا لیکن ایک بات ہے کہ آپ لاہور کی محبت میں تو گرفتار ہو سکتے ہیں لیکن اسے فتح نہیں کر سکتے۔ اس لیے وہ لوگ جو اپنی دانست میں محمود غزنوی بن کر آئے، ان سے یہ سومنات نہ ٹوٹا اور جب ایک مرتبہ اس کے دروازے بند ہو جائیں تو پھر انہیں کھولنے کے لیے ہر طرح کا ''کھل جا سم سم'' بیکار ثابت ہوتا ہے۔''

(سلیم اختر، ڈاکٹر، راموں لعل اور لاہور، ص ۱۱۰)

....

''وہ گریڈوں کے شہر اسلام آباد میں رہتا تھا لیکن شعوری کاوش سے خود

کو ذات پات کے نظام سے الگ رکھا اور ہر ممکن کوشش کی کہ وہ عہدوں سے جنم لینے والی دفتری نظام کی چھوت چھات کی مشین کا محض ایک پرزہ بن کر نہ رہ جائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ادب، موسیقی اور فنون لطیفہ کی صورت میں اپنے لیے ایک چور دروازہ تلاش کر رکھا تھا۔ وہ ہاتھ میں قلم لیتا، کھل جا سم سم، وہ موسیقی کی لہروں میں ڈوب رہا ہے، کھل جا سم سم، وہ کسی قدیم تاریخی عمارت کے حسن سے مسحور ہے، کھل جا سم سم۔"

(سلیم اختر، ڈاکٹر، شہزادہ (منیر احمد شیخ)، ص ۱۵۴)

....

"ہمارے ہاں اکثریت ایسے اصحاب کی ہے جو علمی جستجو کو شرک اور کفر کی سطح تک لے آتے ہیں اسی لیے اساطیر جیسے کافرانہ علوم کا مطالعہ اس بنا پر مذموم ہے کہ ہم توحید پرست ہیں۔ اسی رویہ کی وجہ سے ہمارے ہاں اب بھی سائنس کو مشکوک سمجھا جاتا ہے کہ یہ دین سے بیگانہ کردے گی مگر یہ امر فراموش کر دیا جاتا ہے کہ ہماری دینداری میں بے دینی کی کتنی ملاوٹ ہے۔"

(سلیم اختر، ڈاکٹر، ابن حنیف۔ شخص تنہا تنہا سا، ص ۱۶۸)

....

"ترقی پسندی، روشن خیالی اور خرد افروزی کے خلاف مُلّا، بنیاد پرست اور حکمرانوں کے غیر مقدس اتحاد سے مرتب ہونے والی مثلیث نے یہاں ایک نوع کے ذہنی اور فکری زنداں کی صورت اختیار کیے رکھی، پہلے دن سے لے کر لمحۂ موجود تک، مگر آمر ضیاء الحق کا دور اقتدار جس کا آغاز احسان فراموشی اور جس کا استحکام محسن کشی سے ہوا، روشن خیالی اور خرد افروزی کے لیے بے حد نا مساعد ثابت ہوا۔ ضیاء الحق نے اہل

علم، اہلِ قلم اور اہلِ دانش پر اثر انداز ہونے کے لیے اکادمی ادبیات پاکستان کے زیرِ اہتمام اہلِ قلم کانفرنسوں کا انعقاد کیا جس سے وہ بذاتِ خود بھی خطاب فرمایا کرتے تھے۔ ہم متوسط بلکہ نچلے متوسط طبقہ کے ادیبوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ہم حکومت کے تو باغی ہوتے ہیں لیکن خواب شاہی محلات کے دیکھتے ہیں، چنانچہ ان کانفرنسوں کے شرکاء بننے پر نام کا تمغہ سجائے پانچ ستاروں والے ہوٹلوں کے برآمدوں میں اللہ کبوترے اکڑ اکڑ چلتے پائے گئے۔''

(سلیم اختر، ڈاکٹر، حریتِ فکر کا داعی۔ احمد ندیم قاسمی، ص ۱۸۳)

....

''ویسے تو ہم ہمیشہ ہی سے آمریت کی زد میں رہے ہیں لیکن ضیاء الحق کا عہدِ ستم اپنی مثال آپ ہے۔ اس دور میں اہلِ علم، اہلِ قلم، اہلِ خرد پر جو بیتی وہ اُس عہدِ احتساب کو بے حد خوفناک بنا دیتی ہے۔ کوڑے مارنا، ملازمتوں سے نکالنا الغرض ہر ناجائز طریقے سے زباں بندی کا چلن عام کیا گیا اور اسی عہدِ احتساب میں آغا سہیل نے حلقۂ اربابِ ذوق میں اپنا افسانہ ''جوتا'' پڑھا۔''

(سلیم اختر، ڈاکٹر، ڈاکٹر آغا سہیل، ص ۲۲۳)

....

آپ درج بالا اقتباسات کا ایک مرتبہ پھر عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمالیجیے اور دیکھیے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے کس طرح کہیں علامتی اور کہیں واضح طریقے سے اپنے عہد کے افکار و نظریات اور اشخاص کو محفوظ کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی جتنی بھی مدح سرائی کی جائے کم ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے ''درشن جھروکہ'' کو اپنے خاکوں کی پہلی اور آخری کتاب قرار دیا ہے۔ راقم الحروف کی استدعا یہ ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر کو بھی اپنے عہد کو محفوظ

کرنے کے لیے اپنے قریب ترین دوستوں مثلاً کشور ناہید، مسعود اشعر، ڈاکٹر معین الرحمن، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، صابر لودھی، عطاالحق قاسمی، ڈاکٹر حسن رضوی، انتظار حسین، اصغر ندیم سید، ڈاکٹر سہیل احمد خاں وغیرہ پر بھی خامہ فرسائی کرنا چاہیے تاکہ ہمارے عہد کے متنوع رنگ محفوظ ہو جائیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر ایک اسلوب ساز تخلیق کار ہیں۔ ان کے اسلوب کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں تخلیقیت کے عناصر موجزن ہوتے ہیں۔ ایک طویل عرصے کی تخلیقی ریاضت کے باعث ان کو زبان و بیان پر مکمل عبور حاصل ہے۔ ''درشن جھروکہ'' میں اسالیب کے مختلف اور متنوع ذائقے ملتے ہیں۔ کہیں سادہ بیانی ہے اور کہیں مرصع سازی۔ کہیں مدعا نویسی ہے تو کہیں قافیہ پیمائی۔ تاہم یہ بات طے ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر ہر مقام پر اپنے اسلوب کو اپنے موضوع کا تابع رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے اسلوب اور فکر میں یگانگت ملتی ہے۔ آپ ان کے مختلف خاکوں کے درج ذیل اقتباسات دیکھیے اور ڈاکٹر سلیم اختر کی اسلوبیاتی رنگارنگیوں کی داد دیجیے۔

> ''ٹوپی بہت اچھی چیز ہے لیکن جس طرح مجرم بن کر میں اسے پہننے پر مجبور ہوا اس کا ایسا نفسیاتی ردعمل ہوا کہ اس سکول سے نکلنے کے بعد میں نے زندگی بھر ٹوپی کا نام نہ لیا۔''
>
> (سلیم اختر، ڈاکٹر، حضور عدم آیا ہے، ص ۱۶)

....

> ''سنگساری زنا کی سزا ہے گو میں اس ضمن میں سنگسار ہونا تو پسند نہ کروں گا لیکن ایک بات کا اعتراف کر لوں کہ چند کلیاں نشاط کی چن کر، سنگساری کی صورت میں ان کی بھاری قیمت ادا کرنے سے انسانی محبت میں قربانی کا جو عظیم تصور ابھرتا ہے اس نے ہمیشہ مجھے مسحور کیا ہے۔ اس لیے جب اس مقصدِ خاص کے علاوہ کسی کو سنگسار ہوتے دیکھتا ہوں تو

دلی دکھ ہوتا ہے۔"

(سلیم اختر، ڈاکٹر، خالی بوتل کا المیہ (میرزا ادیب)، ص ۲۷)

....

"ہم نے جس اشفاق احمد کو زیر زمین سونپا وہ ایک جسم تھا مگر ذات و صفات کے لحاظ سے اس کا وجود متنوع جہات کا حامل تھا۔ اشفاق احمد تخلیق کی ایسی پرزم تھا جس سے نکلتی شعاع ہمہ رنگ نظر آنے کے باوجود بھی یک رنگ تھی۔ وہ لفظوں کا بازی گر تھا، لہذا الفاظ سے ہی خیال و تصور کی لیلا رچائی تھی۔ میں جب اشفاق احمد کی شخصیت کا تصور کرتا ہوں تو پانی کی لہروں پر، روشنی کی جھلمل سے بنتے بگڑتے ہر لحظہ نئے روپ دھارن کرتے نقوش میرے ذہن میں آتے ہیں۔ ایسے گریز پا نقوش جو دل کو بھائیں مگر گرفت میں نہ آئیں لیکن اس کے باوجود خود اشفاق احمد نقش بر آب نہ تھا، وہ لوح جہاں پہ حرف مکرر بھی نہ تھا بلکہ وہ تو جریدۂ عالم پر اپنا نام ثبت کر گیا۔"

(سلیم اختر، ڈاکٹر، داستان سرائے کا داستان گو، ص ۵۱)

....

"سب چلے گئے، میں کھڑکی میں سے چاندنی میں نہائی سمندر کی لہریں دیکھ رہا تھا یہ عجیب منظر تھا۔ ہم دونوں باہر آ گئے اور دیر تک یوں ہی گھومتے رہے اور پھر ساحل پر جا پہنچے۔ سمندر کی وہ لہریں جو بند کمرہ کی کھڑکیوں سے مانند تصویر تھیں، اب ہم ان کے شور سے شرابور ہو رہے تھے۔ وقت جیسے تھم گیا اور لمحات منجمد ہو گئے۔ سمندر کے کنارے اس رات ہم کتنی دیر تک بیٹھے، کیا باتیں ہوئیں، کچھ یاد نہیں لیکن اس رات کا تاثر ہنوز اعصاب میں مدوجزر پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد ہم جب بھی ملے، ہم نے اس رات کو ضرور یاد کیا۔"

(سلیم اختر، ڈاکٹر، مشفق خواجہ، ص ۷۱)

''زندگی کا میلہ دامنِ دل کھینچنے والی چیزوں سے بھرا پڑا ہے۔ سمجھدار وہی ہے جو اس میلہ کو محض میلہ ہی سمجھے، گھر نہ جانے۔ زندگی کے اس میلہ میں فلم نگری تو اچھے خاصے طلسم ہوشربا قسم کی چیز ہے۔ آنکھوں میں اندھیرا کر دینے والی تیز روشنی، آبشار کی مانند شرابور کر دینے والی شہرت اور قدم اکھاڑ دینے والی دولت لیکن اور یہ ''لیکن'' بہت بڑی ہے کہ اس کاٹھ محل کی بنیادوں میں دیمک کی بستی بھی ہے۔ اسی لیے طرح دار آتے ہیں، خوب رو جلوہ دکھاتے ہیں، چام کے دام اور دام کے نام ...... پھر اچانک درمیان میں فلم کٹ جانے کی مانند سب ختم۔''

(سلیم اختر، ڈاکٹر، دلدار بے قتیل، ص ۸۷)

''عجب بات ہے کہ دشمن سے پہلی ملاقات مع ضروری تفصیلات اور غیر ضروری جزئیات، بالعموم یاد رہ جاتی ہے مگر دوست سے پہلی ملاقات عام طور پر یاد نہیں رہتی اس لیے کہ دوستی شبنم کی نرم پھوار کی مانند ہوتی ہے، دل کو شاد اور اعصاب کو سرشار کرتی ہے، مدھم سُروں کی مانند شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لیے اس میں ''کھڑکا دڑکا'' نہیں ہوتا۔''

(سلیم اختر، ڈاکٹر، تاج سعید۔ شخص ہفت رنگ، ص ۱۱۸)

''ملتان کی تہذیبی روایات میں عزاداری اور تعزیوں نے خاصا اہم کردار ادا کیا ہے بلکہ ملتان کے تعزیے تو ملک بھر میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ادھر حرم گیٹ سے نکلنے والے استاد اور شاگرد کے تعزیوں نے بھی بہت شہرت حاصل کی ہے۔ بس میرا اور طاہر تونسوی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ ہم استاد اور شاگرد ادب کا تعزیہ اٹھائے پھر رہے

ہیں۔ میں اسے کہتا ہوں عزیزم طاہر تونسوی، یہ اپنا تعزیہ مجھے دے دو میں اسے سنبھال لوں گا لیکن وہ انکار کرتے ہوئے کہتا ہے، سر! آپ اپنا تعزیہ بھی مجھے دے دیں میں آپ کے تعزیے کے ساتھ ساتھ بہاء الدین ذکریا یونیورسٹی کا تعزیہ بھی اٹھا سکتا ہوں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ہم دونوں کے مشترک دشمن یہ کہتے ہیں کہ ہم دونوں استاد شاگرد درحقیقت ادب کا نہیں بلکہ اپنا اپنا تعزیہ اٹھائے پھر رہے ہیں۔“

(سلیم اختر، ڈاکٹر، گرم لہو کی دھمال (ڈاکٹر طاہر تونسوی)، ص ۱۳۳)

....

ڈاکٹر سلیم اختر بذات خود کل وقتی شاعر نہیں ہیں تاہم وہ نثر میں شعر کی افادیت سے کماحقہٗ آگاہ ہیں۔ انہیں علم ہے کہ شعر نثر کا زیور ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اپنے خاکوں کو دل نشیں اور آراستہ کرنے کے لیے انہوں نے جگہ جگہ اشعار کا سہارا لیا ہے۔ اشعار کے برمحل استعمال نے ان کی نثر کو مزید پرتاثیر کر دیا ہے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ ”درشن جھروکہ“ میں بہت سے شعرا کے خاکے بھی موجود ہیں تاہم ڈاکٹر سلیم اختر نے ان خاکوں میں اشعار بطور مثالیں پیش کرنے کی سعی نہیں کی۔ انہوں نے اشعار کے برمحل استعمال سے اپنے موقف کو مضبوط بنانے کی کوشش کی ہے۔ آپ اس کتاب میں استعمال ہونے والے چنیدہ اشعار سے لطف اٹھایئے۔

زندگی کے اُداس لمحوں میں
بے وفا دوست یاد آتے ہیں

....

کیا سیر سب ہم نے گلزارِ عالم
گل دوستی میں عجب رنگ و بو ہے

....

عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمیں انکی الگ اور آسماں سب سے الگ

....

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

....

آنے والی نسلیں تم پر رشک کریں گی ہم عصرو
جب یہ دھیان آئے گا ان کو تم نے فراق کو دیکھا ہے

....

ابھی یہ سرزمیں خالی نہیں ہے نیک بندوں سے
ابھی موجود ہیں ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

....

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں
گو مشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

....

انھیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں
نہ بھائی، ہماری تو ہمت نہیں

....

دیکھے وہ خدوخال تو سوچا ہے بارہا
صحرا کی چاندنی کو بدن کون دے گیا

....

اب تو محسنؔ کے تصور میں اتر ربِّ جلیل
اس اداسی میں تو پتھر بھی خدا لگتا ہے

موڑ آئے نہ کبھی ایسا فسانے میں کوئی
میری مانند نہ تنہا ہو زمانے میں کوئی

....

صحنِ گلزار میں جس پیڑ کے پھل میٹھے تھے
ہم نے اس پیڑ کی تقدیر میں پتھر دیکھے

....

صرف تاریخ میں دو نام یزید اور حسینؓ
جنگ کوئی نہیں جنگِ حق و باطل کے سوا

....

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

....

ابھی تکمیل کو پہنچا نہیں ذہنوں کا گداز
ابھی دنیا کو ضرورت ہے غزل خوانوں کی

....

کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز اذنِ کلام
ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں

....

لوحِ مزار دیکھ کے جی دنگ رہ گیا
ہر ایک سر کے ساتھ فقط سنگ رہ گیا

....

پیدا کہاں ہیں ہم سے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ عصرِ حاضر میں ہماری شخصیت مسخ ہو چکی ہے اور ہمارے چہرے اپنی شناخت سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس ابتر صورت حال میں ڈاکٹر سلیم اختر نے ''درشن جھروکہ'' تخلیق کر کے ہم عصر تخلیق کاروں کے توسط سے ہمارے عہد کو محفوظ کرنے اور ہماری تہذیبی شناخت بحال کرنے کی ممکنہ کاوش کی ہے۔ اس کتاب میں موجود خاکے اپنی فکری اور فنی اہمیت کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیبی صورت حال کو بھی اُجاگر کرنے کا سبب ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ایوانِ ادب میں قائم ہونے والے اس جھروکہ سے علمی و ادبی شخصیات کا درشن بھی کریں اور آنے والے اچھے وقت کی نوید بھی سنیں کہ ڈاکٹر سلیم اختر زیرِ لب کہہ رہے ہیں۔

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے

◆◆◆

◆◆◆

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے ''آشوب'' میں عصری آشوب

◆◆

یہ امر انتہائی افسوس ناک ہے کہ ہمارے معاشرے سے تمام اعلیٰ اخلاقی قدریں رفتہ رفتہ ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔ سیاست پر ان لوگوں کا قبضہ ہے جو عوامی مفادات کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔ اقتصادیات پر وہ لوگ قابض ہیں جو عوام کا خون چوس چوس کر جوان ہوئے ہیں۔ مذہب پر ان کٹھ ملاؤں کا تصرف ہے جو انسانی شریعت سے ناواقف ہیں۔ میڈیا کا ریموٹ ان خودساختہ صحافیوں کے ہاتھ میں آ گیا ہے جو ریاست کے ستونوں کو ایک دوسرے سے ٹکرانے میں بے پناہ مہارت رکھتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ پر ''گھس بیٹھیوں'' کا قبضہ ہے اور وہ ذاتی مفادات کے لیے ان فنون کو بے دریغ برباد کر رہے ہیں۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ صاحبانِ فکر کے مطابق ہم زندگی کے ہر شعبے میں ذلیل ورسوا ہو گئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان تمام اعلیٰ اخلاقی روایات کی پاسداری کریں اور انہیں معاشرے میں رائج کرنے کی کاوش کریں۔ اسی طرح ہمیں ان عظیم المرتبت اور جلیل القدر اصحاب کی پذیرائی بھی کرنی چاہیے جو ہماری مشرقی تہذیب وثقافت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی چلتی پھرتی تصاویر ہیں۔ اس سلسلے میں ہم معروف نقاد، مستند محقق اور بے مثال استاد **ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا** کی مثال پیش کر سکتے ہیں جو عہد ساز شخصیت کے حامل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے نصف صدی تک ا زباں واد

کے معیارات کو بلند کرنے کی مشکور سعی کی ہے۔ ان کے ہزاروں شاگرد آج پوری دنیا میں اردو زبان و ادب کی خدمت پر کمربستہ ہیں اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ

ع یہ ایک شخص نہیں مستقل ادارہ ہے

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی تحقیقی بصیرت اور تنقیدی بصارت کا ایک زمانہ مدح سرائی کر رہا ہے۔ ان کی تمام تخلیقات و مرتبات ان کی بے پناہ صلاحیتوں کی مظہر ہیں۔ کلاسیکی روایات پر گہری نظر رکھنے کے باعث ان کا انتخاب ہمیشہ کڑا ہوتا ہے۔ وہ چیزوں کو محض عمیق نگاہی سے ہی نہیں دیکھتے بلکہ ان میں ایک نیا جہان تلاش کرنے کی کاوش کرتے ہیں۔ عام قارئین اور ناقدین تو شعر و ادب کو سطحی نگاہ سے دیکھنے کے خوگر ہوتے ہیں جبکہ خواجہ صاحب ماورائے سخن بھی بہت سی چیزیں دریافت کر لیتے ہیں کیوں کہ انہیں علم ہے کہ

اے کمالِ سخن کے دیوانے
ماورائے سخن بھی ہے اک بات

ایک سوال ناقدین کے درمیان ہمیشہ باعث نزاع رہا ہے کہ کیا کوئی اچھا نقاد اچھا شاعر یا ادیب ہو سکتا ہے؟؟ اس کا سادہ سا جواب تو یہی ہے کہ "ہاں"۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہمارے عہد میں بہت سے ایسے ناقدین موجود رہے ہیں جنھوں نے اپنے تخلیقی افکار کی روشنی سے اردو ادب کو جگمگا دیا ہے۔ اس سلسلے میں فراق گورکھپوری، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے اسمائے گرامی بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تنقید اور تخلیق ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور ایک اچھے لکھنے والے میں ان دونوں اوصاف کا ہونا لازمی امر ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے جہاں تحقیق و تنقید کی دنیا میں بے مثال کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہاں انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار شاعری میں بھی کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اپنی اس جہت کو زیادہ اہمیت نہیں دی مگر اب وہ سنجیدگی سے اس شعبہ کی جانب مائل ہو رہے ہیں اور

اُمید ہے کہ جلد ہی صاحبانِ دانش ان کی شعری صلاحیتوں سے روشناس ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی تخلیقی قوتوں کا بھرپور اظہار شاعری میں بھی ہوا ہے۔ انہوں نے طالب علمی کے زمانے سے شاعری کا آغاز کیا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری وساری ہے تاہم ڈاکٹر صاحب نے ہمیشہ اپنے آپ کو شاعر کے طور پر پیش کرنے میں احتیاط سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس طرزِ عمل کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے درج ذیل اسباب ہمارے سامنے آتے ہیں۔

(۱) وہ جانتے تھے کہ شاعری سے عارضی شہرت تو نصیب ہو جاتی ہے مگر اسے دوام حاصل نہیں ہو سکتا لہٰذا انہوں نے شعری شہرت کے بجائے تنقیدی گمنامی کو ترجیح دی۔

ناسور ہونے کی قیمت کون دے

ہے وہی اچھا کہ جو گمنام ہے

(۲) مشاعروں میں شاعروں کو دادو تحسین بھی ملتی ہے اور لفافہ بھی۔ اس صورت میں عام انسان تنقید و تحقیق کے میدان کا شہسوار بننے کے بجائے مشاعروں کا پیادہ بننا پسند کرتا ہے۔

(۳) تحقیق و تنقید میں ایک خاص طرح کا مزاج اور مذاق درکار ہوتا ہے جس سے شعرا عموماً تہی ہوتے ہیں۔

(۴) شعرا کے باہمی تنازعات اور سطحی اختلافات انسان کو بڑا کام نہیں کرنے دیتے۔

(۵) شاعری تو چلتے پھرتے ہو سکتی ہے مگر تحقیق و تنقید کے لیے یکسوئی اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

ان وجوہات کے باعث ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری کو جزدان میں سنبھال کر رکھ دیا اور کل وقتی شاعر کے بجائے کل وقتی نقاد کے روپ میں ہمارے سامنے آئے اور اپنی تخلیقات و مرتبات سے ہمارے اذہان کو سیراب کرتے رہے تاہم ان کا شعری سفر آج بھی اسی آب و

تاب سے جاری وساری ہے۔ اُمید واثق ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے شعری مجموعہ ''آشوب'' کو جلد از جلد مرتب فرما کر قارئین کے ذوق میں اضافہ فرمائیں گے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی شاعری دراصل ایک دانا اور زیرک انسان کے ذہن کی خلاقانہ صلاحیتوں کا بھرپور اظہار ہے۔ جب کوئی شاعر زندگی کے ہر رویے کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے کا عادی ہو جائے تو اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ''عمومی'' چیز کو بھی ''خصوصی'' بنا دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہر چیز کو تخلیق کی تیسری آنکھ سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں غور و فکر کی گہرائیاں بھی ملتی ہیں اور دانش و برہان کی گہرائیاں بھی۔ تاہم یہ بات ملحوظ رہے کہ وہ بیدلؔ یا غالبؔ کی طرح شعر کو پیچیدار بنانے کی شعوری کاوش نہیں کرتے۔ چیزوں کو مختلف زاویوں سے دیکھنا تخلیقی عمل ہے اور اپنی تخلیق میں ایسی توانائی پیدا کرنا کہ قارئین اس میں ہشت پہلو اور متنوع رنگ اور زاویے تلاش کریں تخلیقی عمل کی انتہا ہے۔ آپ ڈاکٹر زکریا کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ انہوں نے کس طرح عمومی رویوں کو ایک نئے تناظر میں پیش کرنے کی مشکور سعی کی ہے۔

کوئی پہنچے منزل پر کوئی تھک کے رہ جائے
سب کے واسطے لیکن فاصلہ تو یکساں ہے

....

اب نہیں کھٹکا کوئی دن ڈھل چکا
سامنے اک گہری لمبی شام ہے

....

رہِ حیات سے پُرخار اور طویل مگر
ہر ایک خار مدد کے لیے عصا بھی ہے

اخبار میں جو نام کبھی چھپتے تھے ہر روز
خاک اوڑھ کے سوئے ہوئے ہیں قبر میں گمنام

....

عمل میں سست روی ہے مزاج میں تیزی
کرے گا کون یہاں محنت اور عرق ریزی

....

توقع رکھتے ہیں کس کس سے کار سازی کی
کہ جیسے اس سے بڑا کوئی کارساز نہ ہو

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا معاشرے کے ایک متحرک اور حساس فرد ہیں۔ وہ معاشرے کے اُتار چڑھاؤ اور شکست و ریخت سے باخبر ہیں۔ انہیں علم ہے کہ اخلاقی قدریں کس طرح روبہ زوال ہوتی جارہی ہیں اور اعلیٰ معاشرتی اقدار کس طرح پامال کی جارہی ہیں۔ عدل کے نام پر ظلم کو فروغ دیا جارہا ہے۔ مخربِ اخلاق میڈیا کو صحت مند معاشرے کی ضرورت قرار دیا جارہا ہے اور مذہب کے نام پر فنونِ لطیفہ کا گلا گھونٹا جارہا ہے۔ منافقت کو نظریہ ضرورت کا لبادہ پہنایا جارہا ہے اور وقت کا حاکم کاسۂ گدائی لیے ملکوں ملکوں بھیک مانگ رہا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اس صورتِ حال سے کبیدہ خاطر ہیں۔ ان کا واضح مؤقف یہ ہے کہ جب تک ملک میں عدل و انصاف کی حکمرانی نہیں ہوگی عوام کی تقدیر نہیں بدل سکتی۔ ان کے نزدیک معاشرے کو تمام مخربِ اخلاق خرابیوں سے پاک کرنے سے قبل عوام میں شعور پیدا کرنا بھی ضروری ہے۔ آپ زکریا صاحب کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ وہ معاشرتی اور سماجی صورتِ حال سے کتنے دل گرفتہ اور ملول ہیں تاہم وہ حالات کی چیرہ دستیوں سے مایوس نہیں ہیں۔ ان کا یہی رجائی نقطۂ نظر انہیں زندہ رہنے کا عزم و حوصلہ عطا کرتا ہے۔

جہاں میں اشک فراواں تو ہیں مگر صد شکر
کہ نغمۂ طرب و شعرِ جانفزا بھی ہے

....

سب ایک سے لگیں تو ہے پہچاننا محال
بچنے لگے ہیں شہر کی دھندلی فضا سے ہم

....

کب کے مر گئے ہوتے دیکھنے کو زندہ ہیں
سب سے اونچی کرسی پر کوئی اونچا انساں ہو

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی شاعری کا کثیر حصہ طنز پر مشتمل ہے۔ وہ معاشرے کی ہر تخریبی قوت پر طنز کے تیر برساتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اس دنیا پر چند جابروں کی حکمرانی ہے اور ہمارے سیاسی رہنما ان طاغوتی رہنماؤں کے آلۂ کار بن کر عوام کا شدید استحصال کر رہے ہیں۔ سیاست دانوں اور علمائے سُو نے باہمی اشتراک کر لیا ہے اور وہ عوام کے سماجی حقوق سلب کر کے خود عیش و نشاط کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

جس کو جانو کم نہیں ابلیس سے
جس کو پرکھو فتنۂ ایام ہے

اس طرزِ احساس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خواجہ صاحب خدا پر بھی طنز کرنے لگتے ہیں۔ انہیں محسوس ہوتا کہ بندوں کا اس طرح بے خوف زندگی گزارنا اور خدائی امکانات کو ترک کرنا ناقابلِ فہم ہے۔

ہر چند نا امید تھے کچھ ابتدا سے ہم
مایوس ہو چکے ہیں مگر اب خدا سے ہم

وہ معاشرتی صورتِ حال سے دل گرفتہ ہو کر خدا سے دعا کرتے ہیں مگر حالات کو جوں کا توں

دیکھ کر کفِ افسوس ملتے ہوئے کہتے ہیں۔

عجیب بات ہے لب پر مرے دعا بھی ہے
مگر میں سوچ رہا ہوں کہیں خدا بھی ہے؟

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ان کے خیال میں دینی رہنماؤں نے اپنے طرزِ عمل سے مسلمانوں کو دین سے برگشتہ کر دیا ہے۔ ہر عالم دین قیاسی توجیہات کی بنیاد پر عوام کو گمراہ کرنے میں مصروف ہے۔اس صورتِ حال کا المناک نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ لوگوں نے مذہب ہی سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔وہ مذہبی زعما، کٹھ ملاؤں اور فتویٰ باز مفتیوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

نیکیوں کی بھی خدا توفیق دے
آپ کا کتنا مقدس نام ہے
ہر کسی کی اپنی ہی تفسیر ہے
ہر کسی کا اپنا ہی اسلام ہے

....

جو شخص دولتِ دنیا سے بے نیاز نہ ہو
وہ لاکھ بار پڑھے پھر بھی اک نماز نہ ہو

....

تھیٹر میں کیا کام مناسب نہ ملے دام
اب بیچتے پھرتے ہیں اور اقبال اور اسلام
لیڈر تو بہت سے ہیں نہیں کوئی مسیحا
کیوں نزع کی حالت میں نہ ہو عالمِ اسلام

خواجہ صاحب ہمارے سیاسی رہنماؤں کی ہر حرکت وحیلہ سازی سے بخوبی آگاہ ہیں۔انہیں

علم ہے کہ آج کل سیاستدان ذاتی مفاد کے لیے پوری قوم کو بھی فروخت کرنے کے لیے آمادہ ہو سکتے ہیں۔ ان کے دلوں سے خلوص اور وفا شعاری ختم ہو چکی ہے۔ ان کے قول ان کے عمل کی تصدیق نہیں کرتے۔ شاید ان بدبخت سیاست دانوں کو علم نہیں کہ اب قوم باشعور ہو چکی ہے۔

بیان کیسے ہی چھپتے رہیں یقیں ہے کے
کہ صدق کم ہے زیادہ دروغ آمیزی

خواجہ صاحب باشعور عوام سے استدعا کرتے ہیں کہ

وہی عوام کی قیمت بدل سکے گا یہاں
کہ جس کی صدر اوباما سے ساز باز نہ ہو
اسی کو راہنما کیجیے جو ہو دانا
چلے وہ عقل سے پر عقل حیلہ ساز نہ ہو

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا طنز تعمیری ہے تخریبی نہیں۔ وہ حالات کی یورش سے پر ملال ضرور ہیں لیکن انہیں علم ہے کہ ان کے شعور سے پُر اشعار معاشرتی اصلاح کا فریضہ بطریق احسن ادا کریں گے۔ آپ ان کے درج ذیل طنزیہ اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ وہ معاشرے میں پھیلی ہوئی متنوع برائیوں اور خرابیوں کو کس طرح اُجاگر کرتے ہیں۔

کے کہوں کوئی درد آشنا نہیں ملتا
کہ دل ہے سخت پریشاں مگر ہیں لب خنداں

....

فاقہ کش کروڑوں ہیں پر نہیں کوئی پرساں
کون ان کا پرساں ہو کس کو خوفِ یزداں ہو
دفتروں کے سب عامل فکر و فن میں ہیں کامل
پیچ ڈال دیتے ہیں کام کتنا آساں ہو

رہے نہ پچھلے طریقے بہ فیض انٹرنیٹ
ہوا رواج سحر خوابی اور شب خیزی

....

جو سیدھے راستے لوگوں پہ بند ہو جائیں
تو پھر ہے ایک ہی رستہ فساد انگیزی
زبان ان دنوں اس ملک میں جو رائج ہے
خبر نہیں اسے اردو کہوں کہ انگریزی

....

ہاتھ کیوں ہلائیں ہم خود ہی ٹھیک کر دے گا
آنے والا مہدی ہو یا مسیح دوراں ہو

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی شاعری میں حسن کی سرمستیاں بھی ہیں اور عشق کی نیرنگیاں بھی۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں بطور خاص حسن و عشق کے جملہ تجربات بطریق احسن پیش کیے ہیں۔ ان کی شاعری میں ہجر و وصال کے قصے بھی ہیں اور عاشق کی آبلہ پائی کا بیان بھی۔ محبوب کی ستم آرائیوں کا تذکرہ بھی ہے اور عاشق کی فرماں برداریوں کی داستان بھی۔ رقیب کی عیاریوں کا بیان بھی ہے اور ناصحین کی نصیحتوں کا تذکرہ بھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے غالب کی طرح ہر تجربہ کو ایک نئی شکل عطا کرنے کی شعوری کاوش کی ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عشق ڈاکٹر صاحب کی شاعری میں ذاتی تجربہ ہے یا معروضی رویہ......؟؟ میرے نزدیک یہ دونوں رویے ڈاکٹر صاحب کی شاعری میں جلوہ ریز ہیں۔ **لونجائنس** نے کہا تھا کہ شاعری شدید جذبات کا شدید اظہار ہے۔ اس نقطۂ نظر کی روشنی میں بھی وہی شاعر عظمت سے ہم کنار ہو سکتا ہے جو معروضی رویے کو داخلی تجربہ بنا لے۔ ڈاکٹر صاحب کی شاعری میں جذبات کی جو

گہرائی اور گیرائی ملتی ہے وہ ان کے داخلی اور خارجی تجربات کی عکاس ہے۔ آپ درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ ڈاکٹر صاحب نے عشق وحسن کے کیسے کیسے رنگ اجاگر کیے ہیں۔

اب ایک پل بھی گر تجھے بھولیں کسی سبب
لگتا ہے یہ کہ ہو گئے کچھ بے وفا سے ہم

....

میں اس کے ناز سہوں یہ تو میرے بس میں نہیں
کہ جس کی طبع میں کچھ عجز اور نیاز نہ ہو

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا علم لامحدود، مشاہدہ عمیق، ذہن زرخیز اور مطالعہ وسیع ہے۔ وہ جدید اور کلاسیکی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایک جانب تو وہ میرؔ و غالبؔ کی شعری روایت کے امین ہیں اور دوسری جانب علامہ اقبال اور مجید امجد کے شعری نظام کے علمبردار ہیں۔ آپ خواجہ صاحب کی شاعری کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمایئے تو آپ دیکھیں ان کی شاعری ایک جانب تو جدید اور کلاسیکی شاعری کا سنگم محسوس ہوگی اور دوسری جانب اس میں دونوں ذائقے شیر و شکر ہوتے ہوئے محسوس ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب اس راز سے بخوبی واقف ہیں کہ جدید دور کی لایعنی شاعری محض وقت کا ضیاع ہے اور اس میں آئندہ زمانوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ بڑی عظمت شاعری وہی ہوتی ہے جو **ٹی ایس ایلیٹ** کے بقول روایت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ خواجہ زکریا صاحب بھی جدید شعرا کی طرح ہنگامہ خیز شاعری کر کے قارئین کی نگاہوں کو وقتی طور پر خیرہ کر سکتے تھے لیکن انہوں نے دوامی عناصر کی حامل شاعرانہ فکر کو فروغ دینے کی قابلِ تحسین کاوش کی۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار پڑھیے اور جدت اور کلاسیکیت کا پر تجمل امتزاج ملاحظہ فرمایئے:

حکایتیں گل و بلبل کی کب تلک خواجہ
تمہیں کہو کہ اب ان میں کوئی مزا بھی ہے

....

جو شخص دولتِ دنیا سے بے نیاز نہ ہو
وہ لاکھ بار پڑھے پھر بھی اک نماز نہ ہو

....

تاریک مکانوں کے مکیں پھر بھی ہیں خاموش
روشن ہیں امیروں کے وزیروں کے در و بام

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا اسلوب ان کی شخصیت کی طرح مہذب اور تر و تازہ ہے۔ وہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے سادگی اختیار کرتے ہیں تاہم ان کی سادگی میں بھی پرکاری ہے۔ وہ لفظوں کے تہذیبی سیاق و سباق سے کماحقہٗ آگاہ ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں ہر لفظ نگینے کی طرح جڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اکبرالہٰ آبادی کی طرح انگریزی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں جو شاعری کے حسن میں اضافے کا سبب ہیں۔ وہ انتہائی سلیقے سے نئی تراکیب وضع کرتے ہیں اور پرانی تراکیب و مرکبات سے بھی استفادہ کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ وہ علم بیان و بدیع کے تمام ارکان کو برمحل استعمال کرنے پر کماحقہٗ قدرت رکھتے ہیں۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ ڈاکٹر صاحب نے کتنی ہنرمندی سے اپنی شاعری کو لفظ و معنی کا حسین گنجینہ بنا دیا ہے۔

حقیقتیں ہیں گمانوں میں اس طرح روپوش
کہ جیسے مہر ہو ابرِ سیاہ میں پنہاں

(صنعت تضاد......تشبیہ

جہاں میں اشک فراواں تو ہیں مگر صد شکر
کہ نغمۂ طرب و شعر جانفزا بھی ہے

(تراکیب و مرکبات......صنعت تضاد)

شغل ان کا شب و روز ہے ساز و مے و اصنام
چھلکے نہ، اگر رقص کریں سر پہ دھرا جام

(تراکیب و مرکبات، صنعت تضاد و مراعاۃ النظیر)

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ گرہم معاشرے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی حکمرانی چاہتے ہیں تو ہمیں صاحبانِ علم و ہنر کی یرائی کرنا چاہیے۔ یہ امر انتہائی امتنان کا باعث ہے کہ **ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا** نصف صدی سے علم و ادب و شعر کی آبیاری میں مصروف ہیں۔ انہوں نے اپنے شعری افکار کے ذریعے معاشرے کی قبیح رسوم کی بیخ کنی کی اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کے فروغ کے لیے اپنی حملہ مساعی بروئے کار لائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس گوہرِ یکتا کی قدر کریں اور نا کے افکارِ عالیات کی روشنی سے اپنے معاشرے کی تاریکیوں کو مٹانے کی کوشش کریں۔ گرہم نے اپنی کاہلی اور آلکسی کو ترک نہ کیا تو ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ہمیں اپنے دائرۂ محبت سے یہ کہہ کر نکال دیں گے۔

ندیم ہو وہ مرا، کس طرح یہ ممکن ہے
دماغ جس کا نہ روشن ہو دل گداز نہ ہو

◆◆◆

◆◆◆

طالب جوہری کے شعری جواہر

◆◆

افلاطون سے لے کر شبلی نعمانی تک تمام مفکرین نے خطابت کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کیا ہے۔ خطابت ایک ایسی ساحری ہے جو سامع کو اپنا اسیر کر لیتی ہے۔ خطیب اپنے بسیط الفاظ سے سامع کے حواس خمسہ پر قبضہ کر لیتا ہے اور اس کے ذہن کو اپنے الفاظ کے پروں پر اڑائے لیے جاتا ہے۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سامع کے تمام تر جذبات و احساسات خطیب کے قبضے میں آ جاتے ہیں اور وہ جب چاہے سامع کو ہنساتا اور جب چاہے رُلا دیتا ہے۔ شاعر اور خطیب میں ایک نازک سا فرق یہ ہوتا ہے کہ شاعر اپنے اور قاری کے جذبات کو آمیخت کرتا ہے اور پھر اپنی شاعری کو بااعتبار بناتا ہے جبکہ خطیب صرف الفاظ کے اُتار چڑھاؤ سے سامع کے دلوں پر حکمراں ہو جاتا ہے اور اسے اپنے الفاظ کا تابع بنا کر آنکھ کی پتلی کی طرح پھیرتا رہتا ہے۔ بقول آتش۔

پھرتا ہوں پھیرتا ہے وہ پردہ نشیں جدھر
پتلی کی طرح سے میں نہیں اختیار میں

شاعر لفظوں سے طوطا مینا بناتا ہے اور خطیب اپنے الفاظ سے طوطے مینا میں جان ڈال کر سامع کے سروں پر بٹھا دیتا ہے۔ ارسطو نے بھی خطابت کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے تاہم اس نے شاعری کو خطا صرف فوقیت دی بلکہ خطا کو شاعری کا محض ایک جز قرار دیا ہے۔ اس

صورت حال میں اگر کوئی بلند قامت خطیب اقلیم شعر میں داخل ہو کر شاعروں کو اپنے افکار و نظریات سے مسحور کر دے تو حیرت ہوتی ہے۔ اگر آپ شاعری اور خطابت کا حسین امتزاج دیکھنا چاہتے ہیں تو **حضرت طالب جوہری** کے کلام کا مطالعہ فرمائیے۔ طالب جوہری کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ وہ محض خطیب نہیں بلکہ خطابت کے جملہ محاسن سے مالا مال ہیں۔ میرے خیال میں شاعری خطابت کا زیور ہے اور خطیب اس سے اپنے حُسنِ بیان کو مزید نکھارنے کی کاوش کرتا ہے۔ علامہ طالب جوہری کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ بیک وقت خطابت اور شاعری دونوں میدانوں کے شہ سوار ہیں اور ان کا اسپ فکر ہر میدان میں اپنی جولانیاں دکھانے میں مصروف ہے۔ یہ امر باعث امتنان ہے طالب جوہری کے درج ذیل شعری مجموعے شائع ہو کر صاحبانِ بصیرت اور فہم و فراست کے علمبرداروں سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

۱) حرف نمو (غزلیں/نظمیں)

۲) پس آفاق (غزلیں/نظمیں)

۳) ہدایت (مرثیہ)

دانش مندوں نے اصیل شاعر کی خوبی یہ بتائی ہے کہ وہ اپنی شاعری میں ایک نظام مرتب کرتا ہے اور اس کی پیش کش میں اپنی فنی و فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ **طالب جوہری** ایک زیرک اور ہوش مند شاعر ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری فلسفہ، جمالیات، علمی تبحر، سماجیات اور معتقدات کے پانچ ستونوں پر استوار ہے۔ ان کے کلام میں فلسفہ غور و فکر پر آمادہ کرتا ہے اور کائنات کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھاتا ہے۔ آپ طالب جوہری کی شاعری میں اٹھائے گئے سوالات کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمائیے آپ کو ان کی شاعری پر مرزا غالب کے کلام کی چھوٹ پڑتی نظر آئے گی۔ طالب جوہری کے کلام میں جمالیات کی کئی سطحیں اُبھرتی ہیں۔ وہ حسن کو خارجی مظہر بھی سمجھتے ہیں اور داخلی طرزِ احساس

بھی۔یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں حسن کا وحدت الوجودی نظریہ بھی سامنے آتا ہے اور وحدت الشہودی بھی۔تاہم وہ ہر مقام پر حسن کی ارفع سطح کو چھوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ طالب جوہری نے علم کے جواہر مدینۃ العلم کے گلی کوچوں سے جمع کیے ہیں اور باب مدینۃ العلم کی چوکھٹ کی جبہ سائی نے ان کی علمی وجاہت اور ثقاہت کو بااعتبار بنادیا ہے۔علم کو جنت کا میوہ قرار دیا گیا ہے اور طالب جوہری اپنی شاعری میں یہ میوہ بکثرت تقسیم کررہے ہیں۔طالب جوہری کے معتقدات عدل پر استوار ہیں اور وہ محمدؐ و آل محمدؐ کو دین و دنیا کے لیے نجات دہندہ قرار دیتے ہیں۔ان کی شاعری میں کربلا ایک بلند آہنگ استعارے کی شکل میں ابھرتا ہے۔طالب جوہری سماجی علوم کے گرویدہ ہیں۔ان کے نزدیک سماج کی تبدیلی ناگزیر ہے اور یہ کربلا کی روشنی اور عدل کے قیام کے بغیر ناممکن ہے۔

طالب جوہری نہ تو زاہد تنگ نظر ہیں اور نہ رند بے راہ رو۔وہ حق شناس نگاہ رکھتے ہیں اور حق گوئی کے علمبردار ہیں۔آپ ان کی شاعری میں لطف و تسکین کی جو صورتیں دیکھتے ہیں وہ ان کے مزاج کا خاصا ہے۔ظاہر ہے کہ جب باطن صاف ہو تو اس کی مہک شاعری میں بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔اب تو یہ بات بلاخوف و تردد کہی جاسکتی ہے کہ طالب جوہری اب محض خطابت سے نہیں بلکہ اپنی زریں اور دلکش شاعری کی بدولت بھی شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ پاسکتے ہیں۔بقول طالب جوہری ؎

ہم نے خطابت کیا اپنائی بزمِ نگاراں دور ہوئی
نام تو پہلے سے مشہور تھا صورت بھی مشہور ہوئی

دانش مندوں کے نزدیک کسی شے کی حقیقت کو آشکار کرنے کا نام **فلسفہ** ہے۔جب کوئی فرد کسی بھی شے کے بارے میں کیا، کیوں، کیسے، کب، کب سے، کب تک، کہاں وغیرہ کے بارے میں دریافت کرے تو اس سے فلسفہ جنم لیتا ہے اور جو افراد ان سوالات کے جوابات دیں انہیں فلسفی کہا جاتا ہے۔ایک باشعور اور حساس شاعر بھی کائنات کے بارے

میں غور وفکر کرتا رہتا ہے اور اپنے شعور، فکر اور عقل کے مطابق ان سوالات کے جوابات بھی وضع کرتا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ایک عظیم شاعر فلسفی بھی ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں غالب اور اقبال کے فلسفیانہ افکار انتہائی بیش قیمت ہیں۔ غالب نے اپنی شاعری میں کائنات کے بارے میں جو سوالات اٹھائے ہیں وہ انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ طالب جوہری بھی اسی دانشورانہ روایت کے شاعر ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری کا معتد بہ حصہ فکر وفلسفہ سے پُر ہے بلکہ بعض مقامات پر تو یہ فلسفہ فکری گتھیاں سلجھاتے سلجھاتے بعض نئے حقائق سے روشناس کر دیتا ہے۔ طالب جوہری کی شاعری میں فکر وفلسفہ دو صورتوں میں ظاہر ہوا ہے۔ پہلی شکل میں وہ کائنات اور اس کے متعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ محض کائنات کو نہیں دیکھتے بلکہ پس کائنات کو دیکھنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ وہ اپنے فکری اشعار کے ذریعہ کائنات کے تمام اسرار ورموز سے پردہ اٹھاتے ہیں اور زندگی اور اس کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ تمام افکار کو میزان عقل وخرد پر تولتے ہیں اور ان کے بارے میں اپنے دوٹوک نظریات پیش کرتے ہیں۔ وہ علامہ اقبال کی طرح ایک نیا زمانہ، نئی کائنات اور نئی دنیا کے طلوع ہونے کی نوید سناتے ہیں۔ دوسری شکل میں وہ انسانی ذات اور اس سے منسلک اشیا پر روشنی ڈالتے ہیں وہ انسانی ذات میں چھپے ہوئے جوہر ابھارتے ہیں اور ہستی کی پائیداری اور ناپائیداری پر روشنی ڈالتے ہیں۔ طالب جوہری فلسفیانہ موشگافیاں کرنے کے بجائے اپنے فلسفہ کو انسانی حیات کے لیے مفید بنانے کی کاوش کرتے ہیں۔ وہ عقل وعشق، یقین وگمان، زمان ولامکاں، ازل وابد غرض ہر فلسفیانہ موضوع کو شعری پیکر عطا کرتے ہیں۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار کا گہری نگاہی سے مطالعہ فرمایئے اور ان میں موجزن فکر وفلسفہ دیکھیے:

وہ اک طلسم پس کائنات بھی تو نہ تھا
تلاش پر جو تری کائنات میں نہ ملا

....

پس طومارِ خرد جو بھی اجازہ نکلا
روئے تحقیق پہ اوہام کا - غازہ نکلا

....

تو کیا میں دھوپ اوڑھ لوں گلیم ابر پھینک کر
جو میرے سر کی چھاؤں تھا وہ سائباں کدھر گیا
مرے حصارِ عقل میں گماں یقیں کے ساتھ تھا
گماں یقیں کے ساتھ تھا تو پھر گماں کدھر گیا

....

نیک ہی کا دوسرا پرتو ہے جو کچھ بد میں ہے
عقل کی ہر بات میزانِ قبول و رد میں ہے

....

لازماں اور زماں ایک ہی چیز ہیں یا کہ اضداد ہیں فیصلہ وہ کرے
جس نے دیکھا ہو ناخن کو بڑھتے ہوئے جس نے دیکھی ہو کونپل نکلتے ہوئے

....

ازل سے تا ابد ہے ایک لمحہ
تو پھر یہ وقت میں رفتار کیوں ہے

....

اب ہم ہیں اور گماں پہ اندیشۂ یقیں ہے
اک روز ہر یقیں پہ اندیشۂ گماں تھا

....

مجھ کو مل پایا نہ کیوں اپنی ہی ہستی کا سراغ
آگہی میری چراغِ دستِ نابینا ہے کیا؟

....

ایک ہی نقطہ کے دو رُخ ہیں زماں ہوں یا مکاں
فلسفے نے ہم کو سمجھائے یہ اسرار و حکم

....

میں اپنے باطن کے زلزلوں کی تباہ کاری سے بچ تو نکلا
کھڑا ہوں آتش فشاں کی زد پر بھلا ہو احساس کمتری کا

....

ہر اضافت سے جدا ہوتا تو تجھ کو جانتا
آدمی وقت و گماں کے گنبدِ بے در میں تھا

....

ہم نے اپنی ہستی کا ادراک کیا
دلکش جذبے کھو گئے خشک دلیلوں میں

....

کبھی پنجہ کشی رہی فلسفے سے، کبھی علم کلام سے سر پھوڑا
کبھی ڈس گیا سانپ تصوف کا کبھی چھید گیا عرفان میاں

....

لفظ و معنی کیا ہیں حرف و صوت کی دنیا ہے کیا
دل نے سمجھایا تھا کیا اور عقل نے سمجھا ہے کیا

....

ذات کے آئینے میں کتنے عکس خود اپنی ذات کے ہیں
اک چہرہ بیزار ہو سب سے دوسرا چہرہ بات کرے

معروف یونانی مفکر ارسطو نے انسان کو حیوانِ ناطق کہا تھا۔ ماہرینِ علوم لسانیات کا کہنا ہے کہ نطق و بیان کی صلاحیت انسان کسی مہذب معاشرے ہی سے حاصل کر سکتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حوالے سے ہم انسان کو ''سماجی حیوان'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ دنیا کے بیشتر ناقدین اس امر پر متفق ہیں کہ ادب سماج کی پیداوار ہوتا ہے اور معاشرہ اس پر اپنے اثرات

مرتب کرتا رہتا ہے۔ عظیم تخلیق کار اپنے افکار و نظریات کے ذریعے معاشرے کو تبدیل کر دیتا ہے۔ کسی بھی تہذیب یافتہ معاشرے میں شاعر کی آواز زیادہ پر اثر ہوتی ہے۔ اس کے اشعار سامعین اور قارئین کے حافظوں میں جذب ہو کر حلاوت بھی بخشتے ہیں اور انہیں حرکت و عمل پر بھی آمادہ کرتے ہیں۔ طالب جوہری ایک سنجیدہ فکر شاعر ہیں اور وہ معاشرے کو دانائی کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انہیں معاشرے کے تمام حُسن و قبح بہ آسانی نظر آتے ہیں۔ وہ معاشرے میں طبقاتی نظام کے سخت خلاف ہیں۔ انہیں علم ہے کہ پر آشوب دور میں انسان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جاتا ہے۔ اس کی عزت نفس مجروح ہو جاتی ہے اور وہ خود ساختہ نظام حیات کا قیدی بن کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ طالب جوہری جانتے ہیں کہ جب معاشرے پر آلام کے بادل چھا جاتے ہیں تو انسان اپنے اندر سمٹنا شروع ہو جاتا ہے اور یہی منزل خود شناسی کی بھی ہوتی ہے اور خدا شناسی کی بھی۔ وہ عصر حاضر کے انسان سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

اے دورِ پر آشوب کے بکھرے ہوئے انسان
ممکن ہو تو پھر اپنے ہی پیکر میں سمٹ جا

طالب جوہری معاشرے کے دگرگوں حالات سے کبیدہ خاطر ہیں۔ انہیں علم ہے کہ پوری قوم بے سمتی کا سفر کر رہی ہے۔ نہ تو منزل کی خبر ہے اور نہ راہبر کا علم۔ اس صورتِ حال میں انسان گومگو کی کیفیات کا شکار ہو جاتا ہے۔ افواہیں سر ابھارنے لگتی ہیں اور ہمہ وقت تاج و تخت اُچھالنے کی باتیں ہونے لگتی ہیں۔ اس بدترین صورت حال میں عوام الناس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ لوگ وقت کی چکی میں پسنے لگتے ہیں۔ سب حالات کی گردش کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔ بقول طالب جوہری

سرِ بزمِ قضا اس عالمِ اسباب میں رہنا
ہمیں تو گردشِ حالات کے گرداب میں رہنا

اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ عصرِ حاضر میں انسان کو طرح طرح کے مسائل درپیش ہیں۔ روٹی، کپڑا اور مکان تو انسان کی بنیادی ضرورتیں ہیں لیکن آج کا انسان ان سے بھی محروم ہے۔ اس کا بنیادی سبب ہماری مفلوج اقتصادی پالیسیاں اور نادیدہ استعماری قوتوں کا استحصال ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے سیاسی اور سماجی رہنما سطحی مسائل میں اُلجھ کر قوم کو مزید پریشاں حال کر رہے ہیں۔ طالب جوہری عمیق نگاہی سے ملکی اور بین الاقوامی صورتِ حال کو دیکھ کر چلا اٹھتے ہیں۔

کیسا شکار، کس کے شکاری کہ اے عزیز
ہر شے یہاں فریب ہے دانے سے دام تک

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ استحصالی نظام تبدیل ہو سکتا ہے؟؟ طالب جوہری کا موقف یہ ہے کہ یہ نظام اسی وقت تبدیل ہوگا جب انسان ذاتی مفادات کو ترک کرے گا اور اپنے طرزِ عمل سے یہ بات ثابت کرے گا کہ وہ معاشرے کو تبدیل کرنے کا خواہش مند ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ذاتی مفادات قومی مفادات میں ڈھل جائیں گے تو یہ معاشرہ کامیابی اور کامرانی کی شاہراہ پر گامزن ہو جائے گا۔ بقول طالب جوہری۔

کبھی تو یہ نفع پیشہ انساں مفادِ ذاتی کی قید توڑے
وہ اپنے خنجر کا دُکھ بھی سمجھے جو اپنے خنجر کی آب دیکھے

ہمارے معاشرے کی زبوں حالی کے کئی اسباب ہیں۔ معاشی تفاوت نے امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب ترین کر دیا ہے۔ سماجی عدم مساوات نے عوام کی عزتِ نفس کو مجروح کر دیا ہے۔ انصاف کا حصول ناممکن ہو چکا ہے۔ مذہب کو طالبانِ دینار و درم کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ فنونِ لطیفہ تاراج ہو گئے ہیں۔ بنیادی اخلاقی قدریں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ قحطِ آب و غذا کے باعث لوگ ہجرت اور نقل مکانی کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ دانش مندوں نے خواب دیکھنے چھوڑ دیے ہیں۔ اس منفی صورتِ حالات کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ محنت کی عظمت

مفقود ہوگئی ہے۔ بقول طالب جوہری۔

خریدی جائیں کیا آسائشیں محنت کے سکوں سے
کہ یہ جیب ہنر میں رہ کے بھی بے سود ہوتے ہیں

طالب جوہری اس معاشرتی زبوں حالی سے دل گرفتہ ہو چکے ہیں اور انہیں علم ہے کہ ریاست کے تمام ستون مل کر ہی اس ابتر صورت حال کو درست کر سکتے ہیں۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ انہوں نے ہماری معاشرتی زبوں حالی کے دلخراش مناظر کو کس طرح اجاگر کیا ہے۔

وہی تو ہے مرے کسب معاش کا تاوان
وہ سیم و زر جو ریاست کے اختیار میں ہے

....

اس کرب معیشت نے مری بے وطنی کو
سکھلا دیا چھالوں کی طرح پاؤں میں رہنا

....

لے گئی فکرِ معاش سمندر پار اسے
برسوں بعد جب اپنے گھر پلٹا لڑکا

....

دل معیشت کی چتا میں عمر بھر جلتا رہا
گھر کی دیوی اس کے شعلوں کو ہوا دیتی رہی

....

طالبؔ کس وحشی دنیا میں ڈھونڈتے ہو انسانوں کو
اب وہ سانچے ٹوٹ چکے ہیں جن سانچوں نے ڈھالے لوگ

طالب جوہری محض سماجی نظام کے ٹوٹ پھوٹ پر ہی افسردہ نہیں ہیں بلکہ انہیں اخلاقی اقدار کے زوال کا بھی بے حد دکھ ہے۔ ان کا موقف ہے کہ کوئی معاشرہ سیاست،

معیشت اور معاشرت کے اصولوں سے روگردانی کر کے تو زندہ رہ سکتا ہے لیکن اخلاقی نظام کی تباہی و بربادی کے بعد اس کا جینا دشوار ہو جاتا ہے۔ وہ حالات کی ستم ظریفی پر نوحہ خواں بھی ہیں اور مخرب اخلاق اعمال پر گریہ کناں بھی۔ وہ منافقت کی زندگی بسر کرنے والے احباب پر طنز کے تیر بھی برساتے ہیں اور نطق وقلم بیچنے والے تخلیق کاروں کا چہرہ بھی بے نقاب کرتے ہیں۔ وہ ذاتی مفاد کی خاطر ملک وملت کا سودا کرنے والے بیوپاروں پر سنگِ ملامت بھی برساتے ہیں اور ساحلِ فطرت کے تماشائیوں کو احساسِ غیرت بھی دلاتے ہیں۔ طالب جوہری ایک نیک فطرت اور پاک باطن تخلیق کار ہیں۔ ان کی دیرینہ حسرت ہے کہ کسی بھی طرح ہمارا معاشرہ راہِ راست پر آ جائے اور ہماری تمام اخلاقی قدریں ایک مرتبہ پھر بحال ہو جائیں۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمالیجیے اور دیکھیے کہ انہوں نے اخلاقی قدروں کے زوال کا نوحہ کس طرح پیش کیا ہے۔

عرضِ مطلب پہ سیاسی مصلحت سے کام لینا
قہقہوں کی ڈھال اٹھا کر سسکیوں سے وار کرنا

....

لوگ تو ساحلِ فطرت کے تماشائی تھے
اس سمندر میں تو بس میں ہی اکیلا ڈوبا

....

ہم چراغِ شامِ ہجرت ہیں ہمیں جلنے تو دے
رات، کیوں ان بے وطن آنکھوں پہ برساتی ہے نیند

....

محسنوں کی آنکھ سے کاجل چرا لیتے ہیں لوگ
سوچتے کیا ہو نظر رکھا کرو سامان پر

....

ساری تگ و دو ہے آدمی کی بس سود و زیاں و بیش و کم تک
بازارِ جہاں میں پھر کے دیکھو بک جاتے ہیں نطق اور قلم تک

....

بستی بستی امن کا پرچم لہراتے کچھ لوگ چلے
لیکن ان سے اپنے گھروں میں جنگوں کی تیاری تھی

....

ذرا سنبھل کے قدم رکھ کہ اس زمانے سے
یہ شہر اپنے مفادات کے فشار میں ہے

....

یہ جہاں محشر ہے اس میں کون کس کا آشنا
اجنبی ہونے کا اتنا غم نہ کر اے اجنبی

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا طالب جوہری حالات و واقعات کی صورتِ حال سے اس قدر کبیدہ خاطر اور دل برداشتہ ہو چکے ہیں کہ اب ان کے نزدیک اصلاحِ احوال کی کوئی گنجائش نہیں ہے؟؟ میرے نزدیک طالب جوہری رجائیت پسند شاعر ہیں اور ان کے نزدیک حالات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہو جائیں ان میں بہتری کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ ان کا یہی رجائی نقطۂ نظر انہیں نئے عہد کی بشارت کا احساس دلاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طالب جوہری اپنی معاشرتی خرابیوں پر نظر تو دوڑاتے ہیں لیکن ان کی دیرینہ حسرت ہے کہ معاشرے کو لاحق امراض کا تشفی بخش علاج کیا جائے۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ انہوں نے کس طرح مجبور اور لاچار لوگوں کو ایک نئی زندگی بسر کرنے کا طریقہ عطا کیا ہے اور یہ دشوار کام صرف اور صرف ایک رجائیت پسند شاعر ہی کر سکتا ہے۔

یہ سنگِ راہ اک مہمیز ہے عزمِ مسافر کا
کہ بڑھتی ہے طلب جب راستے مسدود ہوتے ہیں

....

تو سلامت ہے تو اک دن راستہ بن جائے گا
اے مسافر، ان بیابانوں سے روزانہ گزر

....

تو اپنی راہ خود تخلیق کر لے
ہٹاتا جا ہر اک پتھر مسافر

طالب جوھری کی شاعری میں موضوعات کا ایک جنگل آباد ہے۔ انہوں نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے تاہم ان کے طبعی **جوھر حسن و عشق** اور اس کے متعلقہ موضوعات میں کھل کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یاد رہے کہ جمالیات اردو شاعری کا محبوب ترین موضوع رہا ہے اور ولی دکنی سے طالب جوہری تک ہر باصلاحیت شاعر نے اس میدان میں اپنی جودت طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ طالب جوہری کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے حسن وعشق کے بارے میں رائج تمام رویوں کو موضوعاتی سطح پر اپنی شاعری میں سجانے کی بلیغ سعی کی ہے۔ مشرق ومغرب کے تمام مفکرین نے حسن کے بارے میں اپنے گراں قدر افکار ونظریات پیش کیے ہیں۔ بعض فلسفیوں کا خیال ہے کہ حسن داخلی رویہ ہے جبکہ بعض نے اسے معروضی تجربہ قرار دیا ہے۔ طالب جوہری کا موقف یہ ہے کہ حسن حقیقت اولیٰ تک رسائی کا ذریعہ ہے۔ خوبصورت پھول بیک وقت دو تجربات سے آشنا کرتا ہے۔ ایک جانب تو پھول کی رعنائی اور زیبائی انسان کے وجود میں داخل ہو کر اپنے جمالی رُخوں کو دیکھنے والے کے رگ وپے میں شامل کر دیتی ہے اور کسی عاشق کے دل میں گلبدن بس جائے تو اس کے پسینے سے بھی محبوب کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ بقول دردؔ

بسا ہے کون ترے دل میں گلبدن اے دردؔ
کہ بُو گلاب کی آئی ترے پسینے سے

دوسری جانب کسی جمیل وحسین کو دیکھ کر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ خود کتنا حسین ہوگا جس نے اتنا حسین تخلیق کر دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ نیک نفس اور پاک باطن انسان کسی حسین کو

دیکھ کر درود پڑھنا شروع کر دیتے ہیں کہ انہیں تخلیق میں خالق کا پرتو نظر آنے لگتا ہے۔ بقول انیس ؎

پڑھیں درُود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو

طالب جوہری پاک باطن شعرا کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں ایک خاص طرح کی پاکیزگی پھلتی پھولتی ہے۔ طالب جوہری جمالیاتی رُخوں کو اُجاگر کرتے ہوئے تصوف کے سطحی رویوں کو پیش نہیں کرتے تاہم ان کے کلام میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں کی فکری اور فلسفیانہ سطحیں اُبھرتی ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے معروف قول 'اللہ جمیل و یحب الجمال 'کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ کائنات بے حد حسین ہو جاتی ہے۔ طالب جوہری اس قول کے مصداق پوری کائنات میں جمالیات کی لہر سرایت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ انہیں کائنات کی ہر چیز اس لیے حسین محسوس ہوتی ہے کہ حسن ان کی آنکھ میں پرورش پاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ہاں محبوب کا تصور بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ ان کا محبوب روشنی کا پیکر، چاندنی کی مورت اور ناشکیب لمحوں میں عاشق کی ضرورت ہے۔ یہی سبب ہے کہ عاشق صادق یک گیر و محکم گیر کے اصول کو اپناتے ہوئے اپنی پوری زندگی محبوب کی چوکھٹ پر بسر کر دینے پر فخر محسوس کرتا ہے۔ بقول طالب جوہری ؎

غمِ عاشقی تری خیر ہو، مری کائنات سنوار دی
جسے رد کیا تھا دماغ نے وہی بات دل میں اُتار دی

طالب جوہری کی شاعری میں حسن و عشق ایک تخلیقی رویہ بن کر اُبھرتا ہے۔ ان کے ہاں ایک خاص طرح کا تقدس ہے جو عاشق و محبوب کے درمیان حدِ فاصل کھینچ دیتا ہے۔ وہ زاہد تنگ نظر یا واعظ و ناصح کا روپ نہیں دھارتے تاہم ان کے عشق میں ایک خاص طرح کا رکھ

رکھاؤ ہے۔ یہی کیفیت ان کے جمالیاتی موضوعات کو علوئے فکر عطا کرتی ہے۔ طالب جوہری کی شاعری اور خصوصاً غزلوں میں ایک خاص طرح کی گہرائی اور گیرائی کا بنیادی سبب بھی یہی ہے کہ وہ عشقیہ جذبات کو تطہیر کے بعد پیش کرتے ہیں۔

آج پھر دل پہ کسی یاد نے دستک دی ہے
مندمل سمجھے تھے جس زخم کو تازہ نکلا

حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی شاعر عشق و محبت میں فلسفہ ٹھونس دیتا ہے تو اس کی شاعری بے لطف ہو جاتی ہے لیکن طالب جوہری کے ہاں معاملہ بالکل اُلٹ ہے۔ وہ حسن و عشق کی سطح کو اس قدر بلند کر دیتے ہیں کہ قاری کا ذہن پرواز کرتا ہوا آخر کار ان کی فکر سے متصل ہو جاتا ہے۔ یہ وہ خاص صفت ہے جو طالب جوہری کو ہم عصر شعراء سے ممتاز کر دینے کا سبب ہے۔

وہ آنسو بہہ گئے، اچھا ہوا، اک بوجھ تو اُترا
دلِ بے مدعا ٹوٹے ہوئے تاروں کا کیا کرتا

آپ طالب جوہری کے درج ذیل جمالیاتی اشعار کا مطالعہ کیجیے۔ آپ کو ان میں روایتی موضوعات سے مملو اشعار نہیں ملیں گے۔ نہ عاشق کی گریہ وزاری ملے گی اور نہ محبوب کی ہٹ دھرمی۔ تاہم ہر شعر روایت سے جڑا ہوا ملے گا۔ سچی بات یہ ہے کہ طالب جوہری کے عشقیہ اشعار اردو شعری روایت میں اضافہ ہیں اور اس دعوے کی تصدیق کے لیے محض یہ چند منتخب اشعار ہی کافی ہیں۔

وہ اپنے گھر خوش رہے تو شاید میں اپنے ماضی میں لوٹ جاؤں
کہ میرا گھر کب سے منتظر ہے کسی مسافر کے نقشِ پا کا

....

دامنِ کوہ کی ایک شب تھی، سر پہ تاروں بھرا آسماں تھا
میں ترے پاس بیٹھا تھا لیکن، سچ بتا اس گھڑی تو کہاں تھا

....

چل دیا جب وہ تعلق کی طنابیں توڑ کر
ہم نے اس سے اب نہ ملنے کی قسم کھائی تو کیا

....

جس دلِ تنہا میں برسوں سے کوئی رہتا نہ ہو
کون دستک دے بھلا اس خانۂ ویراں پہ

....

یہ عذرِ ترکِ محبت بغیر حرف و بیاں
ہے قبلِ جنبشِ لب اس کا مدعا معلوم

....

تم سے مل کر چمک اٹھتی ہیں مری محرومیاں
اوڑھنی کی اوٹ میں دستِ حنا رکھا کرو

....

یہ سچ ہے اس کا چہرہ عام چہروں کی طرح ہے
مگر اُس قامتِ زیبا میں رعنائی بہت ہے

....

روشنی کا پیکر ہے چاندنی کی مورت ہے
ناشکیب لمحوں میں وہ مری ضرورت ہے

....

چپ رہے تو سنگ ہے، کھل اٹھے تو پھول ہے
یعنی اس کی ہر ادا اک نیا اصول ہے

....

بظاہر کس قدر آساں تھا اس کو بھول جانا
بھلانے پر بھی اس لہجے کی یاد آئی بہت ہے

....

اب آیا ہے ملنے مری خاکستر جاں سے
گزرے ہوئے ایام کے اوراق پلٹ جا

....

دل والوں میں جا کر ڈھونڈو، یک گیری محکم گیری
جنسِ وفا کو ڈھونڈ رہے ہو فتوے کی دوکان کے پاس

....

اس کے گھر سے نکل کر ہم نے شام ڈھلے
کچھ نہیں یاد کہ کتنے گھروں میں جھانکا تھا

....

وہ تری کم سخنی تھی کہ مجھے
بات کرنے کا ہنر یاد آیا

....

کس نام کے طلسم میں گم ہو گئے وہ لوگ
یعنی وہ لوگ بھول گئے اپنا نام تک

....

تمہاری بات سچ سہی وہ نرم خو تو ہے مگر
صدائے زیر اگر کبھی کرخت ہو گئی

....

عطر کے سوداگروں پر بھی کھلے خوشبو کا راز
اے سراپا عطر اس کوچے سے بیگانہ گزر

....

اس کا ہر انداز سجیلا بانکا تھا
کچھ تو بتاؤ وہ خوش پوش کہاں کا تھا

....

پھر کوئی چہرہ ہوا روشن سرِ بام خیال
پھر مجھے مڑنا ہے گم گشتہ زمانوں کی طرف

....

غالباً اب اس کے گھر والوں سے ملنا تھا
گھر پہ دستک دی تو آنچ آنے لگی دالان پر

....

ایمائے فسونِ گنج لب سے صحرائے طلسم چشمِ نم تک
آغاز تھا اس سفر کا تم سے، انجام ہے اس سفر کا ہم تک

....

شاعری انسانی جذبات واحساسات کا بھرپور اظہار کرتی ہے۔ مذہب انسان کی روحانی تشفی کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ انسان اپنے معتقدات میں جتنا مضبوط ہوتا ہے اتنا ہی مذہب اس کی شخصیت سازی میں ممدومعاون ہوتا ہے۔ باشعور شاعر مذہب کی اعلیٰ ترین قدروں کو عملی زندگی میں برتنے کا سلیقہ عطا کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ افلاطون نے اپنی تخئیلی اقلیم میں صرف ان شاعروں کو داخلے کا اجازہ عطا کیا تھا جو مذہب سے والہانہ شیفتگی کے باعث دیوی دیوتاؤں کی مدح وستائش کا حق ادا کرتے تھے۔ طالب جوہری مذہب کی حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں یہی سب ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں حمد، نعت، سلام، منقبت اور مرثیے کے ذریعے خدا، رسولؐ اور اہلبیتؑ سے اپنا تعلق خاطر براہ راست جوڑا ہے تاہم انہوں نے اپنی غزلوں میں بھی مختلف تلازمات، استعارات، تلمیحات اور تشبیہات کے ذریعہ اپنے مذہبی معتقدات کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ طالب جوہری نے اپنی دینی حساسیت کا اظہار مختلف علامات اور استعارات میں کیا ہے۔ انہوں نے تیغ، تبر آگ، خیام، دھواں، دربارِ شام، پیاس، وفا، مشکیزہ، مقتل، لہو، تلوار، صحرا، اشک، تشنگی، بیاباں، خنجر، فرات، تیر، کماں، بیعت، شمشیر، ماتم، عزاداری اور اسی قبیل کے دیگر الفاظ استعمال کر کے

کربلا اور اس کے متعلقات کو بڑی دانائی سے اُجاگر کیا ہے۔ انہوں نے کربلا کو استعماریت کے خلاف ایک علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جہاں ظلم، تمرد اور ہوسنا کی کے سائے منڈلاتے دکھائی دیتے ہیں وہاں طالب جوہری کربلا کی روشنی سے خس و خاشاک کو ہمدوش ثریا کر دیتے ہیں۔ ان کا واضح موقف یہ ہے کہ اگر کوئی فرد عصرِ حاضر کی چیرہ دستیوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے لہو کی دھار کو تلوار بنا لے۔ ان کا نظریہ ہے کہ فتح مندی کے لیے ضروری ہے کہ انسان مقاصد جلیلہ کے حصول کے لیے اپنا سر بھی قربان کر دے۔ آپ طالب جوہری کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ انہوں نے اپنے مذہبی معتقدات کو کتنے سلیقے اور دانائی کے ساتھ پیش کیا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ کہیں بھی شعر کی شعریت یا توقیر میں کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔

روزِ حشر کا ڈر کیسا جب دنیا میں
اس نے ہر ہر عیب کو میرے ڈھانکا تھا

....

پہنچی دلوں کی آگ ہمارے خیام تک
لیکن دھواں تو جائے گا دربارِ شام تک

....

پانی کی پیاس ہی نے بجھائی لہو کی پیاس
اب بات جاری ہے کسی لب تشنہ کام تک

....

ہاتھ کٹے تو مشکیزہ ہم نے روکا تھا
ہم سے پہلے دہر میں ایسا عزم و وفا کا ڈھنگ کہاں

....

اگر چاہو کہ مقتل پار کر لو
لہو کی دھار کو تلوار کر لو

اب اسی سر سے ملے گی آدمی کو روشنی
تیرگی جس کو سرِ نوکِ سناں لے آئی ہے

....

سرِ راہ میرا مطالبہ فقط ایک لقمۂ نان تھا
مگر اس نے میرے مطالبے پہ سواریوں کی قطار دی

....

زندگی اک پل کی مہلت ہے اسے ضائع نہ کر
سیکھ لے مقتل سے جینے کا ہنر اے اجنبی

....

وہ فتح مندی کا اک نشاں تھا کہاں گیا وہ
اسی علاقے میں ایک مینار تھا سروں کا

....

دستِ قاتل کا ارادہ سب پہ ظاہر تھا مگر
سب سے پوشیدہ تھا وہ مفہوم جو خنجر میں تھا

....

عقل کی خاک تیمم ہے ترے قدموں کی دھول
فکر کا آبِ وضو ہے تیری پیشانی کا خم

....

قدم قدم پہ شکستِ خیال کا ماتم
گلی گلی میں تمناؤں کی عزاداری

....

گرمی تھی اور پورا قریہ پیاسا تھا
پانی موجیں مار رہا تھا بیلوں میں

....

یہ مرا مشکیزۂ بے آب، صحرا اور میں
جانتے ہیں پیاس کے آداب صحرا اور میں

....

مٹی کی اُجڑی مانگ میں سیندور جس نے بھر دیا
اس خون کا صدقہ ہیں یہ دنیا کی بزم آرائیاں

....

کوفے کے سارے دروازے آخر مجھ پر بند ہوئے
خوف زدہ گلیوں میں پھرتے پھرتے آخر شام ہوئی

....

اک ٹوٹے نیزے کے سوا کچھ بھی اس کے پاس نہ تھا
پھر بھی فوجیں بھاگ گئیں تیور دیکھ سپاہی کے

معروف نقاد ارسطو نے انسان کو حیوان ناطق قرار دیا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ اب انسان نے اپنے نطق و بیان سے ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان بسیط فاصلوں کو چشم زدن میں طے کرنے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ انسان بنیادی طور پر ماضی پرست ہے اور وہ ماضی کی حسین اور دلگداز یادوں میں اپنی زندگی بسر کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ طالب جوہری بھی علامہ اقبال کی طرح ان شعرا کی صف میں شامل ہیں جو اسلامی تہذیب کی بازیافت چاہتے ہیں۔ وہ یادوں کی الماری کھول کر ماضی کے حسین نقوش تلاش کرتے رہتے ہیں۔ وہ مٹ جانے والی تہذیبوں کو یاد کرتے ہیں اور ان گلیوں اور محلوں کو تلاش کرتے ہیں جن میں ان کے آبا و اجداد قیام پذیر رہے ہیں۔ طالب جوہری کی یہ ماضی پرستی ان کی تخلیقی نمو کا باعث بنتی ہے۔ ماضی کو عام طور پر پرانے اور فرسودہ کے معنی میں لیا جاتا ہے اور کم فہم سمجھتے ہیں کہ ماضی کی یاد میں محو ہو کر انسان حال اور مستقبل سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور مڑ کر پیچھے دیکھنے والا پتھر کا ہو جاتا ہے۔

یادِ ماضی میں کچھ ایسا کھو گئے
مڑ کے دیکھا اور پتھر ہو گئے

طالب جوہری کے نزدیک یہ تصور باطل ہے۔ ماضی کی روشنی انسان کو نئے راستوں کی نوید دیتی ہے۔ معروف نقاد ٹی ایس ایلیٹ کا موقف یہ تھا کہ ماضی کے تاریخی شعور کا مطلب ہی یہ ہے کہ اسے گزرا ہوا تصور نہ کیا جائے بلکہ یہ احساس رکھنا چاہیے کہ یہ حال اور مستقبل دونوں پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔ طالب جوہری کا واضح موقف یہ ہے کہ جدت ہمیشہ روایت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب حال میں رہتے ہوئے کوئی تخلیق کار ماضی سے رجوع کرتا ہے تو وہ گزشتہ عہد کی تمام علمی، ادبی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور لسانی اقدار کو حال میں منتقل کرنے کی مشکور سعی کرتا ہے۔ وہ تاریخی اشیا کی نمائش گاہ میں جانے کے متمنی ہیں۔ وہ تمام کہنہ سراؤں کو دیکھنے کے طلب گار ہیں۔ وہ ماضی کی ناسپاس گلیوں کے پیچ و خم سے بخوبی آگاہ ہیں اور انکا حافظہ ان مقامات سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ تہذیب و ثقافت سے والہانہ شیفتگی میں طالب جوہری علامہ اقبال سے بے حد متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بھی اقبال کی طرح شہروں کی تہذیب و ثقافت سے نالاں دکھائی دیتے ہیں اور کسی دور دراز صحرا یا گاؤں میں زندگی بسر کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ آپ طالب جوہری کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ وہ کس طرح اپنی گم شدہ تہذیب و ثقافت کی بازیافت چاہتے ہیں اور ان کے اشعار میں ہماری تہذیب و ثقافت کی کیسی مہک محسوس کی جارہی ہے۔

سیاحت کے سبھی زخموں پہ مرہم رکھ کے بیٹھا ہوں
میں کتنی بستیوں کی دل نوازی سے وفا کرتا

....

طالب تمہیں شہروں کی ثقافت سے گلہ ہے
اب جاؤ کسی چھوٹے سے اک گاؤں میں رہنا

....

تاریخی اشیا کی نمائش گاہ چلو
تاج دکھاؤں تم کو ایک لٹیرے کا

ثقافت کے خلا میں زندگی دشوار ہے طالب
جو دل ٹوٹے تو جا کر حلقۂ احباب میں رہنا

....

یادوں کی الماری کھولے بیٹھا تھا
ایک اندھیرے کمرے میں بوڑھا لڑکا

....

کتنے ویرانے طے کر کے آیا ہوں میں جھکشوؤں کی یہ کہنہ سرا دیکھنے
یہ عمارت بنائی گئی تھی کبھی، مشرقی قافلوں کی گزرگاہ پر

....

ماضی کی وہ ناسپاس گلیاں منہ ڈھانپ کے سو گئی ہوں شاید
لیکن مرے حافظے میں اب بھی بیدار ہیں ان کے پیچ و خم تک

....

پھر کوئی چہرہ ہوا روشن سرِ بامِ خیال
پھر مجھے مڑنا ہے گم گشتہ زمانوں کی طرف

....

میرے ماضی سے دشمنی کیوں ہے
میرے ماضی کو یاد کرتی شام

طالب جوھری ایک منفرد شاعر ہیں۔ وہ شاہراہِ عام سے بچ کر چلتے ہیں۔ انہیں خبر ہے کہ پر ہجوم شعری آوازوں میں اپنی صدا کو کیسے منفرد بناتے ہیں۔ بقول شکیب جلالی۔

شکیبؔ اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے
ہم اس سے بچ کے چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے

طالب جوہری کا اختصاص محض یہ نہیں ہے کہ انہوں نے منفرد موضوعات کو پیش کر کے اردو شاعری کے موضوعاتی ذخیرے میں اضافہ کیا بلکہ انہوں نے پیش پا افتادہ اور حقیر موضوعات کو

اپنی فکر سلیم سے پُرعظمت بنا کے ناقدین و کاملین فن کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ سزا کو جزا کا روپ قرار دینا طبیعت کی سرنگیں کھودنا، ذروں کا لمحوں سے تصادم، معلوم اور نامعلوم کی درمیانی مسافت، وجود اور عدم کے معاملات اور اسی مزاج اور مذاق کے سینکڑوں مضامین ہیں جو طالب جوہری کی صناعانہ طبیعت کی خبر دیتے ہیں۔

طالب جوہری ایک جدت پسند شاعر ہیں۔ جدید موضوعات سے انہیں رغبت ہے تاہم وہ ایسی جدت کے مخالف ہیں جس سے ابہام و اشتباہ پیدا ہو۔ آپ طالب جوہری کی غزلوں کا عمیق نگاہی سے مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ وہ کس قسم کے منفرد موضوعات کو ہماری شعری روایت کا گراں قدر حصہ بنا رہے ہیں۔

جانے یہ سیلاب کن نام آوروں کو کھا گیا
جانے کیا شجرہ ہے اس بہتے ہوئے شہتیر کا

نہ تنبیہ آگہی کرتی نہ تضحیک ارتقا کرتا
میں بندر کی طرح ویران شاخوں میں رہا کرتا

میرا آنسو تیری آنکھ سے ٹپکا تھا
جوگی رستہ بھول گیا تھا ڈیرے کا

لے کے اپنے ڈھور ڈنگر دشت میں گم ہو گئی وہ
بے وفا ہرنی کے رم پر خود کو کیا بیزار کرتا

چاند تک اُڑ کر پہنچنے کا نہیں امکان، جا
اے چکوری، اپنے گھر والوں کا کہنا مان، جا

علامہ طالب جوہری کی شاعری میں انفرادی موضوعات کا ایک جنگل آباد ہے۔ ان کا علم بسیط، معلومات لامحدود اور تخلیقی اپج فراواں ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ ''عام'' موضوع کو بھی اپنے دستِ ہنر سے ''خاص'' بنا دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں انفرادیت عمودی اور اُفقی دونوں سطحوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک جانب وہ کائنات کی وسعتوں کا سراغ لگاتے ہیں اور دوسری جانب ارضی گیرائی اور اُفقی بلندی کے مظاہر و مناظر کو اپنے اشعار کی زینت بناتے ہیں۔ طالب جوہری محض چشمِ معنی آشنا ہی نہیں رکھتے بلکہ وہ کائنات کو تخلیق کی تیسری آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ اس طرزِ عمل کے باعث وہ اپنے قارئین کے سامنے کائنات کے بیشتر اسرار و رموز سے پردہ اٹھا دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری ایک اہم انکشاف کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور یہی انکشاف انہیں منفرد شاعر بنا دیتا ہے۔ آپ طالب جوہری کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمائیے اور دیکھیے کہ ان میں انفرادیت کے کیسے کیسے رنگ جھلک رہے ہیں۔

گناہ گاروں کو تیرا دوزخ جلا کے کندن بنا رہا ہے
تری عدالت پہ حرف کیسا، سزا بھی اک روپ ہے جزا کا

....

طبیعت کی سرنگیں کھودنے والوں نے کیا پایا
کہ ہر اک گام پہ ذروں کا لمحوں سے تصادم تھا

....

اگر تو سچ کی تاب لا سکے تو میری بات سُن
پتہ نہیں، کہ میں جو تھا ابھی یہاں کدھر گیا

....

میں سو تو جاؤں دشت کی اُداس شام اوڑھ کر
اکیلی جاگتی رہیں گی رات بھر پہاڑیاں

....

خواہش زر کی تیز ہوا نے ڈور سے رشتہ توڑ دیا
دیکھ رہے ہیں اہلِ محلہ اب گرتی ہے پتنگ کہاں

....

ہر ایک دید میں آنکھیں وسیلۂ دل ہیں
دلوں میں چور ہے بدنام ہیں مگر آنکھیں

....

میں آب و گل کی اضافت کا اک تماشا ہوں
کہ تشنہ لب ہوں مگر اس کے حق میں دریا ہوں

....

بدلتے منظرو، تبدیلیاں جبرِ سیاحت میں
جو دل چاہے تو پس منظر کی یکسانی مجھے دے دو

....

جنگل سے جب چاند ابھرا میں نہر کے پل سے اٹھ کے چلا
میرے ساتھ ہی اک گیدڑ کے رونے کی آواز چلی

....

ہم نے اپنی انگلی کل شب دیے کی لو پہ جلا ڈالی
دیا پرایا تھا طاق پہ وہ انگلی تو ہماری تھی

....

اس اندھیرے میں مرا جسم تھا لالٹین اور دیوار کے درمیاں
رات کی تیرگی دیکھتی رہ گئی ایک پیکر کو سائے میں ڈھلتے ہوئے

....

جہت کو بے جہتی کے ہنر نے چھین لیا
مری نگاہ کو میرے ہی فن نے چھین لیا

....

عالمی ادب میں جانوروں اور پرندوں کو ذہانت اور ذکاوت کی علامت بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ بعض تخلیق کاروں نے پرندوں کی خود ساختہ کہانیوں سے حکمت و دانائی کے کئی اہم باب رقم کیے ہیں۔ مشرق میں بھی طیور کو منطق اور فلسفہ کی علامت کے طور پر ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی طرح الہامی کتب میں بھی پرندوں، جانوروں اور حشرات الارض کا ذکر جس تواتر سے پیش کیا گیا ہے اس پر حیرت ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی کئی صورتوں کے اسم ہائے مبارک بھی جانوروں اور پرندوں کے نام سے مخصوص ہیں۔ طالب جوہری کی شاعری میں بھی جگہ جگہ درندوں، چرندوں، پرندوں اور حشرات الارض کا تذکرہ اتنی کثرت سے ملتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ میرے خیال میں طالب جوہری نے ہر پرندے کی نمایاں خصوصیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے اپنی شاعری کی زینت بنایا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ جس پرندے یا جانور کا ذکر ہوتا ہے اس کی بات سمجھنا قاری کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔ یہ ذکاوت آمیز کہانیاں قاری کے لیے نصائح کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

طالب جوہری نے اپنی غزلوں میں جن درندوں، پرندوں، چرندوں اور حشرات الارض کے نام استعمال کیے ہیں ان میں بندر، جھینگر، کوئل، غزال، چیتا، ماہی، سانپ بھنورا، پروانہ، بھیڑ، مورنی، ہاتھی، چکور، چڑیا، شہباز، مکڑی، تتلی، اسپ، شیر، شیرنی، کونج، چکوری، آہو، مگرمچھ، مچھلی، کبوتر، جگنو، ناگ، چیونٹی، گیدڑ، ہرنی، مور، ناقہ، بیل، مکھی، بکری، گنجشک، قاز بطور خاص شامل ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طالب جوہری نے ان تمام حیوانوں کے نام شعری ضرورتوں کے تحت استعمال کیے ہیں یا ان کے پیچھے کوئی فلسفہ پوشیدہ ہے......؟؟ حقیقت یہ ہے کہ طالب جوہری کے کلام کے مطالعے کے بعد آپ خود دیکھیں گے کہ ہر حیوان کو طالب جوہری نے اس کے سیاق وسباق کے مطابق استعمال کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر جانور کے استعمال سے شعر میں ایک جداگانہ موضوع تشکیل پا گیا ہے۔ اس طرح صرف بیسیوں حیوانوں کے استعمال سے بے شمار موضوعات ترتیب پا گئے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے

کہ طالب جوہری نے غزل جیسی کومل صنف میں حیوانوں کو قابل قبول بنا دیا ہے۔ آپ طالب جوہری کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ جانوروں کے بیان سے انہوں نے غزل میں کیا کیا حکمت آموز نکات پیش کر دیے ہیں۔

اپنی خلوت میں در آنا، اپنی حیرت کی طلب میں
بیشۂ خالی میں گھس کر شیر کو بیدار کرنا

....

مت گھبرانا دوست، غبارِ ناقہ سے
ہم نے بھی اس دھول کو برسوں پھانکا تھا

....

حرص کی نظروں میں نانِ چرب و نانِ خشک کیا
کچھ بھی رکھو، مکھیاں آئیں گی دسترخوان پر

....

جنگل سے جب چاند اُبھرا میں نہر کے پُل سے اُٹھ کے چلا
میرے ساتھ ہی اک گیدڑ کے رونے کی آواز چلی

....

اپنے انڈوں پہ بیٹھی ہوئی فاختہ کس قدر مضطرب اور بے چین تھی
گھونسلے کے قریب اس نے دیکھا تھا جب سانپ کو ایک ٹہنی پہ چلتے ہوئے

....

غصہ خدا پہ تھا جو خودی پر اُتر گیا
اس اسپ کی رسائی ہے اپنی لگام تک

....

ہاتھیوں کے پاؤں سے میں کس قدر روندا گیا ہوں
میری عادت بن گیا تھا چیونٹیوں پر وار کرنا

....

ایک طرف سے کھلی ہوئی تھی شیر کی راہ
لیکن اس پر تین طرف سے ہانکا تھا

....

جھپٹ کے جب گرا عقاب اپنے اک شکار پر
ہواؤں سے اُلجھ پڑے بکھر کے بے شمار پر

....

بے مروت جنگلوں سے مور ہجرت کر گیا
مورنی کو اب ہوا احساسِ تنہائی تو کیا

....

لے کے اپنے ڈھور ڈنگر دشت میں گم ہو گئی وہ
بے وفا ہرنی کے رم پر خود کو کیا بیدار کرتا

....

اس کو پہنچانے جب اس کے گاؤں گئے
گاڑی کے بیلوں کو ہم نے ہانکا تھا

....

اپنے خود آزار چرواہے کے غم سے بے نیاز
کس قدر خوش ہیں اچھلتی بکریاں ڈھلوان پر

....

اب مناؤ خیر ہاتھی دانت کے سوداگرو
ہاتھیوں کا غول پلٹا ہے مچانوں کی طرف

....

حرمتِ پرواز کی مجبوریاں درپیش ہیں
ورنہ کب کنجشک مائل تھی اڑانوں کی طرف

....

میرے عزیز ماہی گیر رزق کا وزن کم کرو
بوجھ بہت زیادہ ہے کھے نہ سکو گے ناؤ تم

....

چکور چاندنی میں ساری عمر چیختے رہے
کبھی تو حال پوچھتیں یہ چارہ گر پہاڑیاں

....

یہ شب ماہ اور یہ کھنڈر، آ طلسمات کی سیر کر
اڑتی چمگادڑوں سے نہ ڈر، یہ کنویں میں اتر جائیں گی

....

کل کوئل کی کوک پہ کیسا خون رگوں میں اچھلا تھا
جسم و جاں کے اس مقتل میں اب وہ حالت جنگ کہاں

....

بے صدا گلیوں میں کتے رات بھر روتے رہے
پھر یہ بستی ایک نادیدہ بلا کی زد میں ہے

....

اے عقاب دلبری تو کہاں اتر پڑا
میرے دل کے دشت میں صرف اک ببول ہے

....

یہ آج خوف سا کیوں شیر کے شکار میں ہے
یقیناً اس کے علاوہ بھی کچھ کچھار میں ہے

....

اس کو جھینگر کی صدا نے ریزہ ریزہ کر دیا
ضد ہے ہنگامے کی ورنہ اور سناٹا ہے کیا

....

اس قدر حساس کر دیتا ہے کربِ زندگی
دل میں چبھ جاتا ہے کوئل کی نوا کا زیر و بم

....

کسی ہجوم تمنا میں عرضِ حال کے وقت
کسی غزالِ ہراساں کی تیز رفتاری

....

کیوں پرندے اپنے اپنے گھونسلوں سے اُڑ گئے
ان گھنی شاخوں میں پوشیدہ کوئی چیتا ہے کیا

....

اک کلی کی قامتِ زیبا پھر بھونرے کی نگاہ
ناپتی جاتی تھی جسمِ مرتعش کا زیر و بم

....

جیسے ہی زینہ بولا تہہ خانے کا
کنڈلی مار کے بیٹھا سانپ خزانے پر

....

وقت کی قینچی جس کے پروں کو کاٹ گئی
شمع سے رشتہ ٹوٹ گیا پروانے کا

....

اپنی ساری گمشدہ بھیڑیں جمع تو کیں چرواہے نے
اُن بھیڑوں کے پیچھے پیچھے پورے دن بیتاب رہا

....

یہ زمیں کیسی ہے اور جنگل کا سناٹا ہے کیا
ہاتھیوں کا غول اس میدان سے گزرا ہے کیا

....

ہوا کے رخ پہ کسی بادبان کی لرزش
کسی چکور کی راتوں میں گریہ و زاری

....

الوداعی شام کے دم خوردہ آہو کوچ کر
دن کے رستے پار کرتا ہے تجھے میدان جا

....

اپنی بقا کی جنگ میں چڑیا شہبازوں سے جیت گئی
ترکِ وطن ہی اک حربہ تھا اس ننھی سی جان کے پاس

....

مچھلی کی طرح تو بھی مگرمچھ سے نہ رکھ بیر
آ جائے گا اک دن تجھے دریاؤں میں رہنا

....

وہ مچھلی بھوکے گھر کا مقسوم نہ تھی
پارہ پارہ ہو گیا جال مچھیرے کا

....

وقت کی مکڑی ہر چہرے پر جالے بنتی جائے گی
کس غازے سے صاف کریں گے اس مکڑی کے جالے لوگ

....

کبھی پنجہ کشی رہی فلسفے سے، کبھی علم کلام سے سر پھوڑا
کبھی ڈس گیا سانپ تصوف کا کبھی چھید گیا عرفان میاں

....

بے مقصد پرواز سے تھک کر تتلی پھول پہ بیٹھ گئی
پھول تو اپنی جان سے ہارا تتلی بھی بدنام ہوئی

....

شیر زخمی ہو کے مانند کماں خم تھا مگر
اسلحوں کی زد پہ زخمی شیرنی تلوار تھی

....

روک رکھا تھا اسے میری نوا کے سوز نے
کونج پہلے دن سے اڑنے کے لیے تیار تھی

....

چاند تک اڑ کر پہنچنے کا نہیں امکان جا
اے چکوری، اپنے گھر والوں کا کہنا مان جا

....

نہادِ آشیاں سازی سے بے بس تھا بیا ورنہ
کبوتر کی طرح ٹوٹے مکانوں میں رہا کرتا

....

سر اٹھا کر دیکھ منڈلانے لگا چڑیوں کا غول
اپنی چھت پر ڈال دے دو چار مٹھی دھان جا

....

نہ تنبیہ آگہی کرتی نہ تضحیک ارتقا کرتا
میں بندر کی طرح ویران شاخوں میں رہا کرتا

....

ہر آوارہ لمحہ رین بسیرے کا
جلتا بجھتا جگنو سانجھ سویرے کا

....

طالب جوہری اسلوب ساز شاعر ہیں۔ ان کی شاعری پر علم وفلسفہ کا اسلوبیاتی غلاف چڑھا ہوا ہے۔ وہ الفاظ کے تہذیبی سیاق وسباق سے کماحقہٗ آگاہ ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے اشعار میں الفاظ نگینے کی طرح جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ طالب

جوہری الفاظ کو معنی کی ترسیل کا وسیلہ گردانتے ہیں لہٰذا ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے جذبوں کی صداقت ان کے حروف سے ظاہر ہو۔

منتقل ہو جائے جس سے شعر میں جذبوں کا سچ
ڈھونڈتا اس حرف کا لاتا ہے جوئے شیر کا

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طالب جوہری نے خطابت کے ساتھ ساتھ شاعری کا دامن کیوں تھاما ہے؟؟ اس کا سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ شاعری خطابت سے زیادہ دیرپا اور پراثر ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ایک طویل تقریر سامع پر وہ اثر نہیں ڈالتی جو بعض اوقات ایک شعر مرتسم کر دیتا ہے۔ طالب جوہری کی زبان سے بھی اس سوال کا جواب سن لیجیے۔

ترسیلِ مفہوم کی خاطر روپ بھرا ہے شاعر کا
ورنہ کہاں کے عشق و محبت، اس ذہنی بدحالی میں

طالب جوہری نے نثر کی نسبت شاعری کو اپنے خیالات و افکار کی ترسیل کا موثر ذریعہ قرار دیا ہے اور جو باتیں وہ نثر میں تحریر نہیں کر پائے انھوں نے اسے شعری پیکر عطا کر دیا ہے۔

یہ باتیں نثر میں لکھی نہ جائیں
سو ان باتوں کو تم اشعار کر لو

طالب جوہری نے اپنی غزلوں اور نظموں کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا واضح موقف یہ ہے کہ روایت سے منسلک موضوعات کو جدید لفظوں کے پیرہن میں پیش کرنا چاہیے۔ طالب جوہری ٹی ایس ایلیٹ کے اس نظریے کے علمبردار ہیں کہ بڑی شاعری ہمیشہ روایت سے جڑی ہوتی ہے اور روایت ادب کی بُنت میں شامل ہوتی ہے۔ طالب جوہری نے اپنے شعری اسلوب کو وضع کرتے ہوئے محض جدید لفظیات کا سہارا نہیں لیا بلکہ قدیم جذبات و احساسات کو جدید روپ میں ڈھال کر پیش کرنے کی شعوری کاوش کی ہے۔

قدیم جذبوں کے رنگ میں طالبؔ جدید لفظوں کا پیرہن ہے
نئے تخیل کو باندھنا کیا، غزل کے گیسو سنوارنا کیا

طالب جوہری شاعری میں بے لوث جذبے کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک جب تک شاعر کا دل خون کی شکل اختیار نہ کرلے اس کی تحریر سے روشنی نہیں پھوٹ سکتی۔ تحریر کی اصل قوت شاعر کا بے لوث جذبہ ہی ہوتا ہے۔ بقول طالب جوہری ؎

دل وہ حرف بے ہنر ہے جذبۂ تحریر کا
خون ہو تو رنگ بن جائے کسی تحریر کا

طالب جوہری کی حسرت ہے کہ ان کے عہد کے تمام شعرا کو چاہیے کہ وہ معاشرے کی اصلاح اور تزئین و آرائش کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔

آگ اور خون کے عالمی کھیل پر عصرِ حاضر کے دانشورو کچھ کہو
اب تو جُرمِ خموشی سے توبہ کرو، حرف آنے لگا نطقِ آگاہ پر

طالب جوہری نباضِ فطرت ہیں لہٰذا وہ جانتے ہیں کہ معاشرہ شاعروں کو وہ عزت و توقیر عطا نہیں کرسکتا جس کے وہ مستحق ہیں۔ وہ دانش مند شاعروں کو تلقین کرتے ہیں کہ آج نہیں تو کل ان کے جلائے ہوئے فکری چراغ معاشرے کی تاریکی کو ختم کردیں گے۔

یہ جان کر بھی سخنوروں نے چراغ روشن کیے سخن کے
جو محفلِ خاص میں جلے ہیں، وہ برسرِ عام بجھ گئے ہیں

طالب جوھری شعر کے فنی اسرار و رموز سے کماحقہٗ آگاہ ہیں۔ انہوں نے چھوٹی اور بڑی ہر طرح کی بحور کا انتخاب کیا ہے اور اپنی جدتِ طبع کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ انہوں نے صنائع بدائع کا برمحل استعمال کیا ہے اور مرصع تشبیہات و استعارات استعمال کر کے اپنی بے پناہ فنی مہارت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اسی طرح روزمرہ اور محاورات کے برمحل استعمال نے بھی ان کے اشعار کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ انہوں نے نت نئی تراکیب و مرکبات

وضع کر کے اپنی خداداد صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ علم بدیع و بیان کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

صنعت تضاد

اپنی ہستی نفی و ثبوت کے دو رستوں کا سنگم ہے
اک خنجر سے جان بچانا اک خنجر سے مر جانا

صنعت تلمیح

کشتیِ نوح سے منہ موڑ کے جانے والو
نوح نے جس کو پکارا تھا وہ بیٹا ڈوبا

صنعت مراعاۃ النظیر

وہ جس نے دیکھی نہ ہو خزاں میں بہار اُجڑتے ہوئے چمن کی
سناں سناں شاخِ آہنیں پر کٹے سروں کا گلاب دیکھے

محاورہ

شام ہی خود ہرجائی بن کر آنکھیں پھیرے بیٹھی تھی
ورنہ یوں تو جلتے دیے نے عہد نبھایا شام کے ساتھ

تراکیب و مرکبات

طالب جوہری کی شاعری میں مستعمل تراکیب و مرکبات پر ایک نظر ڈالیے اور ان کی لفظ شناسی کی داد دیجیے۔

دستِ منعم، عنایتِ کاسۂ گدا، پسِ کائنات، مقامِ تجرد، رگِ جاں، اصلِ ذات، چراغ و پروانہ و ہوا، نہادِ آشیاں سازی، پسِ طومارِ خرد، لشکرِ تازہ، غیرتِ آبا، راہبۂ فکر، کربِ معیشت، محوِ تکلم، سرِ چرخِ چہارم، قبائے عقل، پسِ موجِ تبسم، غبارِ ماہ و انجم، حصارِ عقل،

شعلۂ گل، گلیم ابر، سرِ بزمِ قضا، عالمِ اسباب، گردشِ حالات، دیدۂ بے خواب، کفِ سیلاب، دامنِ سیلاب، غبارِ ناقہ، شیشۂ خالی، عرضِ مطلب، دشتِ بے اماں، خاکسترِ جاں، نبردِ جاں، موجِ دریا، دامنِ کوہ، فصلِ بہار، شامِ غم، شامِ فرقت، معنیٔ تحریر، نقشِ قسمت، حرفِ بے ہنر، قرضِ ابد، نقدِ تمنا، بُنِ مُو، محفلِ یاراں، سلامِ پسِ در، بسترِ محنت، چراغِ شامِ ہجرت، شبِ مہتاب، دلِ تنہا، زنجیرِ عدل، دشمنِ جاں، شاخِ مصلحت، شاخِ انتظار، سوادِ شام، طلسمِ کوہساراں، حرمتِ پرواز، سرِ بامِ خیال، بازارِ جہاں، وجودِ عدم، فشارِ فکر، طلسمِ انا، عذرِ ترکِ محبت، قبلِ جنبشِ لب، حرفِ تشبیہ، لمحۂ قربِ رائیگاں، فسونِ چشم و دل، جرمِ آفتاب، خواہشِ زر، وسیلۂ دل، مصرِ جاں، غبارِ روِ زلیخا، ذرۂ ناچیز، حسبِ نظامِ صحرا، ریگزارِ ازل، شبِ وصال، سرِ میداں، سرِ کہسار، روحِ صحرا، جبرِ سیاحت، دستِ حنا، نقدِ دلبری، خیالِ کاہ، دستِ گدا، سرِ بادباں، نطق و لب، سرِ شاخِ جاں، شامِ خزاں، جنسِ رائیگاں، کتابِ جاں، مفادِ ذاتی، منصوبۂ ازل، درونِ کتاب، بادِ برق انداز، زلفِ دراز، کربِ محرومی، سطحِ آب، عتابِ دلیری، ترکِ خواہش، نگاہِ درویش، قامتِ زیبا، اظہارِ نسبت، اقرارِ نسبت، مفادِ ذات، موجِ نیل، سرِ ریگِ رواں، ہوائے مہرباں، گردِ سفر، غبارِ بے ہنر، سرِ نوکِ سناں، روحِ سفر، بناتِ شبِ تار، شاخِ مژگاں، خلوتِ جاں، فصلِ بے آب، شہرِ وصال، تیرگیٔ شبِ وداع، بانگِ کلاغ، سرِ شاخِ مصلحت، نقدِ خیر، لقمۂ نان، عزمِ چرخِ پیما، چوبِ خشک، موجِ دریا، موجِ مہرباں، چشمِ تر، چاکِ پیرہن، دستِ گل فروشاں، دستِ ہنرمند، نقشِ ہنر، چشمِ شوق، جسدِ بے ہنر، حجلۂ معنی، منزلِ تسلیم، چترِ سعادت، دیدۂ امکاں، دیارِ وحشت، نواحِ دل، رزقِ زمیں، مہارِ ناقۂ جاں، شبِ ملامت، چراغِ سرِ رہگزر، آبِ وضو، احساسِ کمتری، شہرِ اہلِ کرم، رُخِ تابندہ، گردِ ملال، شکستِ خیال، وفورِ شرم، غزالِ ہراساں، لبِ سوال، عزمِ بیداری، عتابِ بزرگاں، محیطِ ذات، عالمِ تمثیل، عہدِ رفتہ، لرزشِ اقرار، ترکِ وطن، ندیمِ دوست، بوئے دوست، قصۂ بے مہریٔ احباب، سجدۂ بے اختیار، سرِ شام، محفلِ خاص، برسرِ عام، نشیب و فرازِ فن، خلافِ رسم، دامنِ

یار، ہجرِ یار، آسودۂ خواب، ترسیلِ مفہوم جیب ہنر، طرزِ مسلسل، غبارِ کوئے ہجرت، آغوشِ صدف، بحرِ طوفاں خیز، خشتِ اول، چشمِ تصور، کہفِ ماضی، عہدِ حال، سوادِ شہرِ وفا، پسِ اقرار، سطحِ آب، بے مہریِ احباب، دیارِ قاتلاں، موجِ دریا، دشتِ دل، چادرِ ماہ وغیرہ وغیرہ۔

اب یہ بات بلاشک و بلاتردد کہی جاسکتی ہے کہ طالب جوہری کے اسلوب میں ایک خاص طرح کی حلاوت ہے جو ان کے صادق جذبوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کے اسلوب میں ولی کی شیرینی، میر کی گہرائی، غالب کا تفکر، یگانہ کی کاٹ اور اقبال کی گھن گرج شامل ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ طالب جوہری کا اسلوب شعر ان کی صاحب طرز شخصیت کا آئینہ دار ہے۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ خطابت اور شاعری دو جداگانہ فنون ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے مفید اور کارآمد ہوتے ہیں اور جس شخصیت میں یہ دونوں فنون اپنی سطوت اور شان و شوکت کے ساتھ یکجا ہوئے ہیں ان کا نامِ نامی اسمِ گرامی **طالب جوہری** ہے۔ طالب جوہری کی شاعری میں خطیبانہ رنگ جھلکتا ہے تاہم انہوں نے اپنے خونِ جگر سے مصرعے کشید کیے ہیں۔ طالب جوہری کی شاعری میں ذات کا اظہار بھی ہے اور سماج کے مسائل کی پیش کش بھی۔ تاہم یہ بات طے ہے کہ انہوں نے خطابت کے ساتھ ساتھ شاعری کو اپنی ذات کی ترسیل اور خیالات دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ بنایا ہے جب تک اردو شاعری زندہ ہے طالب جوہری کے زرّیں افکار و نظریات اپنی مہک سے گلشنِ ادب کو معطر کرتے رہیں گے۔

بقول طالب جوہری۔

ترسیلِ مفہوم کی خاطر روپ بھرا ہے شاعر کا
ورنہ کہاں کے عشق و محبت اس ذہنی بدحالی میں

◆◆◆

◆◆◆

غضنفر عباس کی شعری کائنات

◆◆

شاعری انسانی جذبات واحساسات کا برملا اظہار ہے۔ جب منجھے ہوئے خیالات شدت جذبات کے ساتھ اپنا اظہار کرتے ہیں تو عظیم شاعری وجود میں آتی ہے۔ اسی لیے معروف نقاد لونجائنس نے ترفع بخش شاعری کے لیے شدتِ جذبات کو بے پناہ اہمیت دی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر شاعر کے اندر جذباتی کشمکش نہ ہو تو اس کے خیالات پھیکے اور روکھے محسوس ہوں گے۔ آپ دنیا کی عظیم شاعری کا مطالعہ فرمالیجیے، آپ دیکھیں گے کہ اس میں شدید جذبات کا شدید اظہار ملتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا محض جذبات کی حدت اور بیان کی شدت سے بڑی شاعری وجود میں آجاتی ہے تو میرے نزدیک ان دونوں کے درمیان ایک باریک سی لکیر "تاثیر" کی بھی ہے۔ میں تو یہاں تک کہنے میں بھی باک محسوس نہیں کرتا کہ بے تاثیر شاعری جذبات کی حدت اور اظہار کی شدت کو بھی بے توقیر کر دیتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تاثیر خیالات سے پیدا ہوتی ہے یا الفاظ سے وجود میں آتی ہے؟ میرے خیال میں یہ توفیق ایزدی کے بغیر ممکن نہیں۔ غیب سے نازل ہونے والے مضامین ہی پرتاثیر ہوتے ہیں۔ کلیوں کو حُسن عطا کرنے والا ہی آنکھوں کو تاثیر کی دولت سے نوازتا ہے۔ اس حوالے سے میں **رانا غضنفر عباس** کی اس رائے سے کسی حد تک متفق ہوں کہ

''موجِ الہام کو معرضِ ابلاغ میں لانا میرے بس میں کہاں، میں تو بس اپنی فگار آنکھیں کورے کاغذ پر رکھے نمودِ حرف کا تماشا دیکھتا ہوں۔ صوت و آہنگ کے سارے معجزے تو وہ نغمہ گرِ ہستی خود بپا کرتا ہے جو قطرے کو گہر اور غنچہ ہائے حرف و معانی کو گلاب کرتا ہے۔ میرے اندر سر اٹھاتی تمک و تازِ تخلیق بھی اسی کا حسنِ عطا ہے ورنہ میں کیا اور مری بساط ہنر کیا؟''

(رانا غضنفر عباس، دستک، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۴)

رانا غضنفر عباس پنجاب کے ایک پسماندہ اور دور افتادہ علاقہ عارف والا میں مقیم ہیں تاہم انہوں نے اپنی جدت طبع کے باعث خود کو ہمیشہ علم و ادب کے مرکزی دھارے میں شامل رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب مضافات میں بسنے والے ایک بڑے یورپی شاعر سے کہا گیا کہ وہ اپنا گاؤں چھوڑ کر مرکزی شہر میں منتقل ہو جائے تو اس نے کہا تھا کہ ''میرا گاؤں تو پہلے ہی بہت چھوٹا ہے اور اگر میں بھی اسے چھوڑ دوں گا تو یہ اور بھی چھوٹا ہو جائے گا۔'' آج عارف والا بھی غضنفر عباس کی وجہ سے بڑا بڑا محسوس ہوتا ہے۔

رانا غضنفر عباس کا پہلا مجموعۂ کلام ''دستک'' ۲۰۰۵ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ عطاء الحق قاسمی نے اس مجموعے میں موجود شاعری کو دیکھ کر غضنفر عباس کو شاعرِ خوش نوا قرار دیا۔ محسن احسان کے نزدیک غضنفر عباس نے قرطاس صاف و سادہ پر اپنے لہو سے نقش گری کی ہے۔ قاضی ظفر اقبال نے اسے تازہ ہوا کا جھونکا کہا جبکہ خود غضنفر عباس نے کہا کہ ''بابِ علم پر یہ بے بضاعت دستک اسی کا بیانیہ ہے۔'' مجموعی طور پر ''دستک'' کو صاحبانِ علم و فراست نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس مجموعے کے ذریعہ ہی غضنفر عباس نے بابِ شہرت پر دستک دی اور مضافاتی ادب کے دائرے سے نکل کر شعر و ادب کے مرکزی دائرے میں داخل ہو گئے۔ یہ مجموعہ دراصل عصری کشمکش سے زیادہ غضنفر عباس کی رومان پرور طبیعت کا غماز دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے اپنے ماحول میں رچے

ہوئے فطرت کی رعنائیوں سے بھی لطف اٹھایا ہے اور رومان پرور جذبوں کا بھی بے لاگ اظہار کیا ہے۔ آپ اس مجموعے میں موجود چند اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ غضنفر عباس نے حسن و جمال کے کیسے کیسے مظاہر پیش کیے ہیں:

تم بھی آ جانا سمندر کا تماشا دیکھنے
جب سرِ ساحل وہ چہرہ چاند سا لے کر چلوں

....

چھوڑ غصہ پیار کے میٹھے سروں میں بات کر
اس طرح ہم جولیوں سے روٹھنا اچھا نہیں

....

جانے کس خوشبو کا پرچم کھل گیا گلزار میں
رقص کرتا شہر نکلا کوچہ و بازار میں

....

زہر میں ڈوبی ہوئی ہے زندگی
کوئی شیریں لب صدا دیتا نہیں

....

چھوڑ اس خوابِ جگر سوز کا قصہ اب تو
زخمِ تعبیر بہت گہرا ہے بھر جانے دے

....

کبھی اک نام لکھنا رات دن کاغذ کے پرزوں پر
کبھی شب بھر کسی تصویر سے باتیں کیا کرنا

....

لفظ اُتریں گے اُجالوں کی قبائیں پہنیں
پیار کی جوت اگر دل میں جلا لی جائے

....

یہ جہاں گردی نبھاتی ہے مضامین نئے
شاعری ورنہ حکایت لب و رُخسار کی ہے

....

رانا غضنفر عباس کی شاعرانہ تخلیقی ہنرمندیوں کا دوسرا مظہر ''شب رایگاں'' کی صورت میں جلوہ گر ہو رہا ہے۔ اس مجموعہ کے آغاز میں موصوف نے بڑی دانائی سے اپنے تخلیقی سفر کی روداد بیان کی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

> ''میری والہانہ ''دستک'' نے آخرِ کار کئی بند دروازے کھول دیے ہیں اور اب میں مسلسل اُمڈتے اُمڈتے ہوئے بے کراں خوابوں کی زد میں ہوں۔ ہر پل، ہر لمحہ، منزلِ موہوم کی بے جہت پکار اپنی سمت بلاتی ہے اور میں، اِس اور سے اُس اور، اِس کے تعاقب میں پوری قوت سے بھاگتا ہوں مگر ہر بار لاحاصلی اک نیا زخم دے کر کسی اور جانب روانہ کر دیتی ہے۔ یوں عمرِ گریز پا کا اک اور پل میرے ہاتھ سے پھسل جاتا ہے۔ یہی رایگانی میرا مقدر ہے یا لق و دق صحرا کے اُس پار کوئی چشمۂ آبِ رواں میرا منتظر!''

حقیقت یہ ہے کہ ''شب رایگاں'' ''دستک'' کا اگلا پڑاؤ ہے منزل نہیں۔

رانا غضنفر عباس کے اس مجموعے میں موضوعاتی تنوع ملتا ہے۔ وہ منیر نیازی کی طرح اس کائنات کو ایک پر تجسس انسان کی طرح دیکھتے ہیں۔ اس کائنات کی حیرت انگیزیاں ان کے ہوش و خرد کو متحیر کرنے کا موجب بنتی ہیں۔ اس لق و دق صحرائے زندگی میں آ کر اپنی دو آنکھوں سے ہر منظر کو دیکھنا بھی غضنفر عباس کے لیے باعث حیرت ہے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے پوری کائنات کو تخلیق کی تیسری آنکھ سے دیکھنے اور دکھانے کی مشکور سعی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کی حیرت انگیزیوں کا ادراک اسی وقت صحیح طور پر ہو سکتا ہے جب ہم ظاہری سطح سے بلند ہو کر چیزوں کا مطالعہ کریں۔ غضنفر عباس

کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ انھوں نے ہمارے لیے ان اشعار میں سوچ اور فکر کے کتنے زاویے اُجاگر کر دیے ہیں۔

پھر سے ٹھہرے پانیوں میں کوئی پتھر پھینکیے
یہ سمندر رفتہ رفتہ آئنہ ہونے کو ہو

....

بس اپنی خوئے اسیری نے رنگ بدلا ہے
قفس سے لوٹ کے آئے ہیں گھر مسلط ہے

....

کسے خبر ہے یہاں کس بلا کا سایہ ہے
کہ اپنا شہر بھی اپنا نہیں پرایا ہے

....

بستیاں تیرتی رہیں یوں ہی
ایک دریا نگر میں آ ٹھہرے

....

ہوا کے دوش پہ رقصاں ہے بحر و بر کا ہجوم
بدن بگولا مگر بحر و بر سے آگے ہے

....

غضنفر عباس کی شاعری میں ''خواب'' ایک اہم استعارے کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ فرائڈ نے کہا تھا کہ انسان جو کچھ عمل کی دنیا میں نہیں کر پاتا وہ خواب کی دنیا میں کر لیتا ہے۔ غضنفر عباس نے اس بھری پُری دنیا کو چھوڑ کر خواب نگر آباد کر لیے ہیں۔ وہ خواب کو حقیقت کی دنیا کا اصل قرار دیتے ہیں۔ وہ خواب شہرِ جمال کے متمنی ہیں۔ وہ اپنے محبوب کی تلاش میں شہرِ خواب ہی میں در بدر پھر رہے ہیں۔ وہ روزنِ خواب سے کائنات کے سربستہ رازوں کو دیکھنے کے متمنی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کی آنکھ میں بھی وہی

خواب اتارنے کے شوقین ہیں جو ان کی آنکھوں میں پوشیدہ ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غضنفر عباس کو یہ خواب اتنے کیوں پسند ہیں......؟؟ میرے خیال میں غضنفر عباس سمجھتے ہیں کہ شب کو صرف اور صرف خواب ہی رائیگاں ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ وہ خواب کو کس طرح نئی معنویت دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

کب تک گردشِ دوراں کا تماشا دیکھوں
اپنا ہر خواب تری آنکھ میں اُترا دیکھوں

....

خواب بکھرانے لگی ہیں بے شباہت ساعتیں
خال و خد کھلنے کو ہیں اک نقش وا ہونے کو ہے

....

شہرِ در بند سے نکلوں تو کوئی بات بنے
روزنِ خواب سے کب تک یہ تماشا دیکھوں

....

مری آنکھ جلوہ پرست ہے مجھے خوابِ شہرِ جمال دے
ترے پاس جتنے بھی چاند ہیں مرے غم کدے میں اُچھال دے

....

یہ کس کا شوق لیے پھر رہا ہے شہر بہ شہر
یہ کیسا خواب، شب دربدر مُسلّط ہے

....

شکستِ خواب سے آگے بھی اک ترائی ہے
رہینِ خواب کو ان دلدلوں سے کیا لینا

....

رانا غضنفر عباس کی شاعری میں معاشرے میں پھیلی ہوئی بے چینیوں، چیرہ دستیوں اور نیرنگیوں پر بے لاگ طنز ملتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے میں بڑھتی ہوئی سماجی ناانصافی، ریاکاری، تفاوت، عدم مساوات اور منافرت پر اشک بار بھی ہیں اور شعلہ فشاں بھی۔ وہ حالات کو راہ راست پر لانے کے متمنی ہیں اور ان کی دیرینہ تمنا ہے کہ ہمارا معاشرہ امن و امان کا گہوارہ بن جائے۔ اس طرز احساس کے باعث کہا جاسکتا ہے کہ غضنفر عباس کی شاعری میں عصری حسیت کے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ آپ ان کی شاعری کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمایئے تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارا پورا عہد اپنی تمام منفی اور مثبت حشر سامانیوں کے ساتھ اس میں جلوہ گر ہے۔ معاشرے کی قبیح رسومات اور عادات کو ختم کر کے ایک مستحسن معاشرہ تخلیق کرنا غضنفر عباس کی شاعری کا بنیادی مشن ہے۔ ان کے درج ذیل اشعار سے ہمارے مؤقف کی تائید ہو جائے گی۔

اس گلی کا ہر جھروکا بے صدا ہونے کو ہے
کون جانے اس نگر میں اور کیا ہونے کو ہے

....

ہر ایک کام کا موجب کوئی ضرورت ہے
ہر ایک شخص پہ آسیب زر مُسلّط ہے

....

درد کی کتنی تہیں ہیں درمیانِ زندگی
ایک سے نکلیں تو فوراً دوسرا ہونے لگے

....

زہر آلودہ زبانیں نہ سُخن بخت ہوئیں
شہرِ در بند سے آسیب کا سایا نہ گیا

....

اگرچہ شہر پہ آسیب کا سایہ مسلط ہے
مگر جو دل کو ڈستا ہے وہ ڈر یکسر علیحدہ ہے

غضنفر عباس کی شاعری میں موضوعات کے ساتھ ساتھ اسالیب کے بھی متنوع ذائقے ملتے ہیں۔ وہ غزل کی زبان سے کماحقہٗ آگاہ ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں میں الفاظ کو برتنے کا ایک خاص سلیقہ ہے۔ حالیؔ نے معیاری شاعری کے لیے تفحص الفاظ کو ضروری قرار دیا تھا اور غضنفر عباس نے اس مجموعے میں حالیؔ کے اس نظریے کی عملی تفسیر پیش کر دی ہے۔ انہوں نے لفظوں کو خاص تہذیبی سیاق وسباق کے مطابق استعمال کیا ہے اور صنائع لفظی و معنوی سے خوب خوب کام لیا ہے۔ ان کی شاعری میں ناصر کاظمی کی طرح تجسیم کاری کے نادر نمونے ملتے ہیں۔ اس مجموعے میں استعمال ہونے والی درج ذیل تراکیب و مرکبات کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ غضنفر عباس نے کس طرح اپنی غزلوں کو اسلوبیاتی سطح پر منفرد بنانے کی شعوری کوشش کی ہے۔

شہر آشوب، خوابِ شہرِ جمال، شبِ رائیگاں، دستِ ہنر، اوجِ کمال، دلِ مضطرب، نشیبِ شام، خوئے اسیری، نشاطِ بے خبری، فریبِ جادۂ منزل، تب و تابِ صبحِ جمال، شبِ مضمحل، رگِ جاں، سوادِ ہجر، میانِ رفتگاں، شبِ دربدر، پسِ بام و در، چشمِ پژمردہ، حصارِ دامِ فسوں، سرِ بحر و بر، آسیبِ زر، شورشِ آب، صیدِ زبوں، نشاطِ ابرِ رواں، کفِ شیشہ گر، نشاطِ رنجِ سفر، دامِ فسوں خیز، نہنگِ موجِ اجل، ہجرت دربدر، رقصِ صبا، قبائے تمنا، صفِ زنداں، خوابِ بے تعبیر، دستِ تمنا، خوابِ بے تعبیر، روزنِ خواب، حرفِ رائیگاں، جذبِ طلب خیز، گنبدِ بے در، دشتِ لامکاں، سوادِ ہجر، نگارِ حرف، ساعتِ بے کیف، سوزِ بلبل، مہلتِ یک نفس، تہمتِ شب، ساعتِ بے ثمر، بساطِ لب، نشاطِ ضبط، دامِ محبت، سوزنِ ہر نفس، ساحرِ چالاک، حسنِ بلاخیز، بزمِ عیش و نشاط، شوقِ وارفتگاں، عہدِ نمو، شبِ غم کشا، صراحتِ شوق، دشتِ حزن و ملال، ناخنِ وحشی، شاخِ طلب، رہینِ خواب۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ عظیم شاعری اسی وقت وجود میں آتی ہے جب ارفع خیالات کو دل پذیر اسلوب میں پیش کیا جائے۔ غضنفر عباس کی تمام شاعری عموماً اور شب رایگاں کی شاعری خصوصاً ہمارے پیش کردہ مؤقف کی گواہ ہے۔ اس مجموعے کی غزلیں اور نظمیں بیک وقت ہمارے دلوں کو متاثر بلکہ مسحور کرنے کا موجب بنتی ہیں بلکہ بعض غزلیں اور نظمیں تو ناصر کاظمی اور منیر نیازی کی شاعری کا عکسِ جمیل معلوم ہوتی ہیں۔ اگر غضنفر عباس کی شاعری کا یہ سفر اسی آن بان اور ہوش مندی کے ساتھ جاری رہا تو آنے والا وقت ان کے ہونے کی خود گواہی دے گا اور اوج کمال تک پہنچنے کی اس کی یہ حسرت بھی پوری ہو جائے گی کہ

کسی چشم و لب کے طلسم کو مرے آئینوں کا اسیر کر
مجھے پھر سے دستِ ہنر بنا مجھے پھر سے اوج کمال دے

◆◆◆

صحرائے قطر کا آہو — محمد ممتاز راشد

یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ عصرِ حاضر کی تنقید، تحسین اور تنقیص کے دائروں میں بٹ گئی ہے۔ بیشتر تنقیدی مقالات یا تو ''ستائش باہمی'' کے نتیجہ میں ظاہر ہوتے ہیں یا کسی ''برہمی'' کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس صورتِ حال کے نتیجے میں قاری کا اس ''شکستہ تنقید'' سے اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ تنقید پر قاری کے اعتبار کو بحال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عصرِ حاضر کے ناقدین غیر جانبداری کا مظاہرہ کریں، ورنہ تنقید کی اس ناگفتہ صورتِ حال کو مدنظر رکھتے ہوئے قارئین بھی کرکٹ کی دنیا کی طرح ادبی دنیا میں ''نیوٹرل نقاد'' کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔

عصرِ حاضر میں زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب پر بھی ایک جمود کی کیفیت طاری ہے۔ معاشرتی اور سیاسی شکست و ریخت کے اثرات ادب پر بھی مرتسم ہو رہے ہیں اور غالباً اسی زبوں حالی کی بنا پر ادیب، ادب اور قاری کی مثلث ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی ہے۔ ادیب قاری کے تقاضوں سے ناآشنا ہے اور قاری ادیب کے خیالات و نظریات سے بے خبر رہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس دورنگی نے ادب کو ''چوں چوں کا مربہ'' بنا دیا ہے۔ نظریہ سازی کا فقدان ہوتا جا رہا ہے اور اب ہوا کے رُخ پر چلنے والے بادنما ادیب نظریہ ساز شمار ہونے لگے ہیں۔ ادیب ذاتی فوائد کے حصول کے لیے قلم کو بیچ

چکے ہیں اور اسی بنا پر قاری کا رُخ ادبی و شعری کتب سے ہٹ کر جاسوسی رسائل کی طرف پھر گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ادیب اور شاعر اپنے عہد کے تقاضوں کو سمجھیں اور قاری کے لیے ایسی نثری و شعری تخلیقات پیش کریں جو ان میں ذوق پیدا کرنے کا موجب بنیں۔

اُردو میں بے شمار ایسے تخلیق کار ہیں جنہوں نے معاشرتی رویوں کی پیش کش کے لیے اپنی تخلیقات کو وقف کر رکھا ہے۔ وہ اپنی ہر تخلیق کو معاشرے کے کسی نہ کسی رویے کا مظہر بنانے کی کاوش کرتے ہیں۔ **محمد ممتاز راشد** بھی ان چنیدہ تخلیق کاروں میں شامل ہیں جنہوں نے اپنی شاعری اور نثر کو ذات اور کائنات دونوں کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ وہ ذات سے آفاق اور آفاق سے ذات کے تشکیلی مراحل بحسن و خوبی ادا کر رہے ہیں۔ اب ذیل میں ان کے مختصراً کوائف پیش خدمت ہیں تاکہ قارئین ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا خود بھی اندازہ لگا سکیں۔

❖ کوائف

• نام	محمد ممتاز راشد
• ولدیت	میاں محمد شفیع
• ولادت	۲۵ نومبر ۱۹۵۳ء
• مقامِ پیدائش	مزنگ، لاہور
• زوجہ	زاہدہ بیگم
• اولاد	شکیلا ارجمند، عفرا، شبانہ ناز (بیٹیاں)
	عدیل ممتاز، شرجیل ممتاز (بیٹے)

❖ تعلیم

• پرائمری	ایم۔سی پرائمری سکول، محمود بوٹی، لاہور
• میٹرک	گورنمنٹ ہائی سکول، باغبانپورہ، لاہور

- بی۔اے — علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
- ڈرافٹسمین کورسز — پاک جرمن ٹیکنیکل ٹریننگ سنٹر، لاہور
  گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی، لاہور
- کمپیوٹر کورسز — آٹو کیڈ...... فیملی کمپیوٹر سنٹر، دوحہ۔قطر
- زبانِ عربی — چار سالہ ڈپلومہ کورس۔لینگویج انسٹی ٹیوٹ، قطر

❖ ملازمت

- اورینٹ ماچس فیکٹری لاہور
- این ڈی آئی ایس سی ڈیزائن سنٹر، لاہور
- این ای سی سی دوحہ۔قطر
- قطر الیکٹریسٹی، قطر (کہرماء)

❖ اعزازات

- ادبی ایوارڈ، پاک یوتھ سوسائٹی قطر
- اعزازی وثیقہ، مجلسِ فروغِ اُردو، قطر
- توصیفی سند، پاکستان ایمبیسی، قطر
- نشانِ فضیلت، پاکستان کلب، بحرین
- بہترین غزل گو ایوارڈ، بن رائز رائٹرز فورم پاکستان، قطر
- اعزازِ فضیلت ایوارڈ، نظریۂ پاکستان فیڈریشن، لاہور
- سفینۂ ادب ایوارڈ، گوجرانوالہ، پاکستان
- بیسٹ سروسز ایوارڈ، پاکستان یوتھ اینڈ چلڈرن فاؤنڈیشن، اسلام آباد
- نشانِ سپاس، ماہنامہ 'ہیلو' انٹرنیشنل فورم، لاہور
- ادبی ایوارڈ ارباب فکروفن، کویت

- خصوصی گوشہ برائے محمد ممتاز راشد، ماہنامہ 'شاعر' بمبئی، مئی ۲۰۰۶ء
- خصوصی نمبر برائے محمد ممتاز راشد، ماہنامہ 'سلسلہ' کراچی، ۲۰۰۱ء
- خصوصی نمبر برائے محمد ممتاز راشد، سہ ماہی 'ادبی شاہین' اندور، ۲۰۰۷ء

❖ اصلاحِ سخن (تلمیذ)

- جناب علامہ ذوقی مظفرنگری جانشین حضرت احسان دانش

❖ تصنیفات

- صحرا کی ٹھنڈی شامیں (تذکرہ شعرائے قطر)
- کاوش (غزلیں)
- عقیدتِ خام (حمد و نعت و سلام)
- تیری خوشبو سے دل مہکتا ہے (رومانی قطعات)
- سخن ریزے (فردیات)
- ہم ہیں اپنے مزاج کے بندے (معاشرتی قطعات)
- لاہور کے نئے پرانے رنگ (تذکرہ و تاریخ)
- مذاق مذاق میں (مزاحیہ شاعری)
- اِک بات محبت کی (غزلیں)
- تیرا جادو بول رہا ہے (نظمیں)

❖ زیرِ ترتیب

- کرماں دی چھاں کردے (پنجابی شاعری)
- جب لاڈلا منا جاگے گا (بچوں کیلئے نظمیں)
- ایک محرومی کا ازالہ (افسانے)
- مدحت سرائی (حمد و نعت)

- تبصروں کی آنچ (درجنوں کتب پر تبصرے)
- منفرد بیت بازی (مبنی بر کلام ممتاز راشد)

❖ ادب پروری

- صدر ادارہ 'خیال و فن' قطر
- جنرل سیکرٹری، پاک یوتھ سوسائٹی، قطر
- چیئرمین، بزمِ اُردو، قطر
- ادبی مشیر، پاکستان آرٹس سوسائٹی، قطر

❖ رابطہ

(۱) پوسٹ بکس نمبر ۸۱۶۲، دوحہ۔ قطر۔ فون: ۵۲۰۰۶۲۱ (۰۰۹۷۴)

(۲) سارہ ہاؤس، ۱۔ ٹیپ روڈ، لاہور۔ فون: ۷۳۱۱۵۱۸ (۰۰۹۲۴)

محمد ممتاز راشد کی یوں تو ہر تخلیق اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہم اور لائق توجہ ہے تاہم ''اک بات محبت کی'' اس اعتبار سے قابلِ قدر ہے کہ اس میں انسان کے بنیادی جذبے ''محبت'' کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ موضوع جہاں ایک جانب قاری کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرتا ہے وہاں دوسری جانب ممتاز راشد کی بے پناہ صلاحیتوں کا مظہر بھی ہے۔ ممتاز راشد کا وصف خاص یہ ہے کہ انہوں نے ہم عصر شعرا کی طرح اس پامال موضوع کو سطحی جذبات کی سیرابی کے لیے مخصوص نہیں کیا بلکہ محبت کو علوئے فکر کے لیے استعمال کیا ہے۔ انہوں نے محبت کی اک بات سے سینکڑوں قصے اُجاگر کیے ہیں گویا اک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی مشکور سعی کی ہے۔ اگر آپ ممتاز راشد کے تخلیقی دوائر سے آگاہ ہیں تو آپ کو علم ہوگا کہ غزل ان کے تخلیقی ہنر کا بنیادی دائرہ ہے اور اس دائرے کا مرکزی نقطہ محبت ہے۔ آپ ان کی غزل کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمائیے اور دیکھیے کہ انہوں نے محبت کے کیا کیا روپ اور مظاہر پیش کیے ہیں:

اظہار محبت میں نہیں دیر لگائی
صد شکر کہ یہ کام تو برجستہ کیا ہے

محبت کس طرح کی ہے، یہ نفرت ہے تو کیسی ہے
نہ مجھ سے دور جاتے ہو، نہ آنکھیں چار کرتے ہو

....

خیال و فکر میں ندرت ملا گیا ہے کوئی
مجھے غزل کا سلیقہ سکھا گیا ہے کوئی

....

جگنو چمکیں، تارے مہکیں
تو آئے تو رستے مہکیں

....

بہت نفرتوں نے بلایا ہمیں
محبت کی خو نے بچایا ہمیں

....

یونہی جب وہ نیلے پیلے ہوتے ہیں
پیار بڑھانے کے یہ حیلے ہوتے ہیں

....

اک ترا رنگ جفا بدلا نہیں
ورنہ اس دنیا میں کیا بدلا نہیں

....

ہم ان کے حُسن خصائل کی قدر کرتے ہیں
نہ جانے کیا ہے کسی کا نسب نہیں معلوم

....

اپنوں کا جبر، غیروں کے طعنے، غم معاش
راہِ وفا میں کتنے ہوئے امتحاں نہ پوچھ

....

جو تیرے شہر، تیرے در و بام کے نہیں
ایسے تصورات مرے کام کے نہیں

....

کسی کے لطف و کرم کا ہے معجزہ راشد
کہ صحن دل میں شگفتہ گلاب اُترے ہیں

....

اس کی یادیں ہی سہارا بن گئیں
کہ جس نے بے سہارا رکھ دیا

....

دل کہ رہتا تھا بے قرار بہت
غم سمیٹے تو کچھ قرار آیا

....

تیرے بعد آوارگی کو اوڑھ کر
زندہ رہنے کا سہارا رکھ لیا

....

عشق جس فرد میں تنویر فشاں ہوتا ہے
اس کے سینے میں چراغاں کا سماں ہوتا ہے

....

شورشِ عہدِ محبت کا اثر کچھ کم ہے
اب بھی دل میں ہے ترا درد مگر کچھ کم ہے

....

ممتاز راشد کی غزلوں میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے جو جسمانی طور پر وطن سے دور رہ کر بھی روحانی اور قلبی طور پر خود کو وطن میں محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے ملک کی تفرقہ بازی اور دہشت گردی سے نالاں ہے اور یہاں کی ظلم و ستم کی داستانیں اسے بے قرار کر دیتی

ہیں۔ وہ جھوٹ، فریب، ریاکاری، خوش کن وعدوں، افلاس، منافقت، فقہی اختلافات، زیست کے حادثات، معاشرتی ناانصافی اور حاکمانِ بے چہرہ سے زچ ہو کر اپنے ہم وطنوں سے التماس کرتا ہے کہ:

جسے چاہو اسے رسوا نہ کرنا
ستم کرنا مگر ایسا نہ کرنا
بہت اُجلا ہے آنگن قربتوں کا
جدائی سے اسے میلا نہ کرنا
رواداری کی باتیں خوب لیکن
کبھی غیرت پہ سمجھوتہ نہ کرنا
ملے منصب تمہیں گر منصفی کا
تو پھر انصاف کا جھٹکا نہ کرنا
رویے میں لچک رکھنا مگر تم
کبھی مقصد پہ سمجھوتا نہ کرنا
اگر لکھنا تو لکھنا حرف روشن
یونہی کاغذ کو تم کالا نہ کرنا

ممتاز راشد وطن سے دور رہنے کے باوجود وطن کے معاملات سے لاتعلق نہیں ہیں۔ وہ اپنے وطن کے موسموں، رنگوں، تتلیوں، پہاڑوں، صحراؤں، بہاروں، دریاؤں، غرض ہر چیز سے والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ان کا وطن رشکِ بہشت ہے اور وہ اپنے وطن کے لیے ہر چیز قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اپنے وطن پاکستان سے والہانہ محبت کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ انہوں نے قطر جیسے صحرائی علاقے میں اردو زبان اور ادب کے فروغ کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کر دی ہیں۔ انہوں نے اپنے ادبی جریدے ''خیال و فن''

کے ذریعہ سے بے شمار تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی کی ہے اور نوجوان لکھنے والوں کو اُردو زبان سے رغبت دلانے اور پاکستان سے محبت کا جذبہ بیدار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہی دونوں عوامل ان کے افکار و نظریات کے لیے بھی مفید و معاون ثابت ہوئے ہیں۔

ممتاز راشد کی غزلوں میں طنزیہ رجحان بھی وافر مقدار میں ملتا ہے۔ وہ کبھی تو اپنی ذات پر طنز کرتے ہیں اور کبھی معاشرتی روّیوں اور زوال آمادہ قدروں پر طنز کے تیر برساتے ہیں۔ کبھی ان کا طنز ذات سے شروع ہو کر پوری کائنات پر پھیل جاتا ہے اور کبھی پورے معاشرے کا طنز ان کی ذات میں سمٹ آتا ہے۔ اصل بات صرف یہ ہے کہ ممتاز راشد کی شاعری پھیلتی ہے تو آفاق پر حاوی ہو جاتی ہے اور جب سمٹتی ہے تو شاعر کی ذات میں مقید ہو جاتی ہے۔ آپ ان کی غزل کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے اور اس میں طنز کی زہرناکی دیکھیے:

آپ نے تو جو بھی چاہا، جو بھی سوچا ہو گیا
مسئلہ تو ان کا ہے جن کا مقدر سو گیا

....

فائدے سارے سمیٹے آپ نے
میرے ذمے ہر خسارہ رکھ دیا

....

تعصب کو لبادہ کر لیا کیا
تباہی کا ارادہ کر لیا کیا؟

....

خوب اس کی پہچان ہے اپنے لوگوں میں
دھوکہ دینا عادت، اور وتیرہ جھوٹ
سچ کا حلف اٹھا کر بھی وہ جو بولا
آدھا اس میں سچ تھا باقی آدھا جھوٹ

ہمارے دل کو غموں سے نڈھال رکھتے ہیں
یہ آپ خوب ہمارا خیال رکھتے ہیں
ہمیں ملال نہیں بے وفا زمانے کا
تری جفاؤں کا لیکن ملال رکھتے ہیں

....

کچھ سوالوں میں کچھ جوابوں میں
عمر گزری انھی عذابوں میں
وقت پڑنے پہ کچھ نہ کام آیا
جو پڑھایا گیا نصابوں میں

....

گلا خواہشوں کا دبائے ہوئے ہیں
کہ حالات سے تنگ آئے ہوئے ہیں
وہ خود بھی تماشا بنیں گے یقیناً
ہمیں جو تماشا بنائے ہوئے ہیں

ممتاز راشد کا اختصاص یہ ہے کہ وہ حالات کی یورش اور تقدیر کی بے حسی سے گھبراتے نہیں بلکہ نامساعد حالات میں بھی اُمید کے چراغ جلاتے ہیں۔ وہ غم انگیز ماحول میں بھی مسکرانے کا عزم رکھتے ہیں اور اہلِ دنیا پر واضح کرتے ہیں کہ عقل مند وہ ہوتا ہے جو تلخ اور ترش حالات میں بھی خوشگوار اور شیریں زندگی گزارنے کا سلیقہ رکھتا ہے۔ راشد کی یہی رجائیت انہیں ہم عصر شعرا میں ممتاز بنا دیتی ہے۔ ان کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیے:

سدا سہولتیں پیدا کرو جہاں کے لیے
نشانِ راہ بنو اہلِ کارواں کے لیے
کہیں ہے کوئی رکاوٹ تو غم نہیں راشد
بہت سے اور بھی رستے ہیں کارواں کے لیے

اب چلتے چلتے چند باتیں ممتاز راشد کے اسلوب کے بارے میں بھی سن لیجیے۔ ممتاز راشد کی غزلوں میں غیر محسوساتی طریقے سے ٹ، ڈ اور ڑ کے حروف کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ اسے حسنِ اتفاق کہیے یا لفظوں کا ساختیاتی نظام کہ یہ تینوں حروف غزل کے کومل جذبات کے اظہار میں مانع ہیں۔ ممتاز راشد نے شیخ امام بخش ناسخ کی طرح کمال یہ دکھایا ہے کہ غیر مانوس الفاظ کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ وہ ہر دل عزیز بن جاتے ہیں۔ آپ ان کی چار غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

جھوٹے نے تو پل میں بولا فرفر جھوٹ
جو سچا تھا اس کے گلے میں اٹکا جھوٹ
فنکاری کے زمرے میں آ جاتے ہیں
خوش کن ڈینگیں، ستھرے ڈھونگ اور عمدہ جھوٹ

....

جب ہوئیں میری وحشتیں گڈمڈ
ہو گئیں ساری صورتیں گڈمڈ
دیکھیے لیجے اُلجھ گئے نا پھر؟
اور کیجیے روایتیں گڈمڈ

....

جو آفتوں کے تناظر میں کٹ کے دیکھتے ہیں
وہ زندگی کو زمانے سے ہٹ کر دیکھتے ہیں
یہ دیکھ کر کہ کوئی دیکھتا نہیں راشدؔ
ہم اس کے پھول سے چہرے کو ڈٹ کے دیکھتے ہیں

....

جواں ہونے لگے ہیں گھر کے بچے
کہیں اب گھر کا آنگن بٹ نہ جائے

ممتاز راشد زبان و بیان پر مہارت رکھنے والے کلاسیکی شاعر تو نہیں ہیں لیکن آپ ان کی غزلوں کی ردیفوں کا مطالعہ فرمایئے تو آپ دیکھیں گے کہ ان پر دبستانِ ناسخ کی چھوٹ پڑتی نظر آتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

جو نہیں اپنی ذات سے مانوس
کیسے ہو کائنات سے مانوس

....

ہجوم درد و الم کا سبب نہیں معلوم
تمام شہر ہے کیوں جاں بہ لب نہیں معلوم

....

فقط شہرت کا رستہ ڈھونڈتے نئیں
کہ عزت کام سے ہے نام سے نئیں
ستم بردوش آتی ہیں غموں کی سرد برساتیں
جلاتی ہیں، رُلاتی ہیں غموں کی سرد برساتیں

....

تنہائیوں کی شب ہے، اُداسی کا شور ہے
یادوں کی انجمن ہے خموشی کا شور ہے

....

حبس تو سب کو عام فراہم کیے گئے
روزن برائے نام فراہم کیے گئے

....

اک خوبرو جواں کی جوانی سفر میں ہے
اور اس کے ساتھ روپ کی رانی سفر میں ہے

....

خیر اور شر کو تولنے سے نہ رُک
عدل کے حق میں بولنے سے نہ رک

....

اب بھی ہے سوالات کا معیار سلامت
اب بھی ہیں ترے شہر میں خوددار سلامت

....

ممتاز راشد کا اسلوبِ شعر دوسرے شعرا سے منفرد نظر آتا ہے۔ لفظوں کی نشست و برخاست اور تراکیب و مرکبات کا استعمال واضح کرتا ہے کہ ممتاز راشد الفاظ کے تہذیبی سیاق و سباق سے کماحقہٗ آگاہ ہیں۔ وہ علم بیان و بدیع کے استعمال پر بھی قدرت رکھتے ہیں لیکن انہوں نے اپنے خیال کی انفرادیت کو لفظی اُلٹ پھیر کے لیے کہیں بھی قربان نہیں کیا۔ ممتاز راشد زبان و بیان کی نزاکتوں سے آگاہ ہیں اور یہی چیز انہیں دوسرے شاعروں سے نمایاں کرنے کا سبب ہے۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ شعرا کو چاہیے کہ وہ اپنے شعری افکار کے ذریعہ قارئین کو ادب کی جانب مائل بھی کریں اور عملی زندگی میں اپنے موضوعات کے ذریعہ ان کی سمت نمائی بھی کریں۔ ہمارے لیے یہ امر انتہائی اطمنان کا باعث ہے کہ "اک بات محبت کی" میں ممتاز راشد نے یہ دونوں امور حُسن اور سلیقے سے انجام دیے ہیں۔ ان کا تخلیقی سفر ابھی جاری ہے اور لطف یہ ہے کہ اپنی عاجزی کے باعث وہ آج بھی اہلِ دانش سے کہہ رہے ہیں کہ

ہزار شعر بھی لکھتا ہوں نثر بھی راشد
کہاں ہے منزل شعر و ادب نہیں معلوم

◆◆◆

◆◆◆

اقبال حیدر کی مرثیہ نگاری۔ چند معروضات

◆◆

عصرِ حاضر میں انسان طرح طرح کے مسائل سے نبرد آزما ہے۔ غمِ جاناں سے نجات ملتی ہے تو غمِ دوراں گھیر لیتا ہے۔ ذاتی مسائل سے پیچھا چھڑانے والا انسان آفاقی مسائل سے دوچار ہو جاتا ہے۔ ایک جانب تو دنیا گلوبل ویلج سے سمٹ کر گلوبل ہٹ میں سما گئی ہے اور دوسری جانب ذات کے مسائل نے آفاق کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ اس ابتر صورتِ حال نے حساس دل رکھنے والے تخلیق کاروں کو بے قرار کر دیا ہے۔ دوسروں کو نئی زندگی کی نوید سنانے والے فنکار آج خود نوحہ خواں ہیں کہ

دنیا میں حادثات کی اقبالؔ حد نہیں
انسان مر نہ جائے تو بے چارہ کیا کرے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس درد بھری کائنات میں انسان خوشیوں اور مسرتوں کے چند لمحات کہاں سے مستعار لے......؟؟ حقیقت یہ ہے کہ دائمی مسرت دولت اور شہرت سے حاصل نہیں ہوتی۔ لازوال خوشی تو انسان کے اندر سے پھوٹتی ہے۔ اطمینانِ قلب وہ عظیم اور لازوال دولت ہے جس پر کئی جہاں قربان کیے جاسکتے ہیں۔ اطمینانِ قلب کے حصول کے لیے انسان کو ان ذواتِ مقدسہ کا دامن تھامنا پڑتا ہے جو شفیع المذنبین بھی ہوتی ہیں اور رحمۃ اللعالمین بھی۔ جو لوگ محمد و آلِ محمدؐ کے عشق میں سرشار رہتے ہیں دنیا و آخرت کی تمام

کامیابیاں ان کے قدم چومتی ہیں۔ بقول وحید ہاشمی ؎

ہمارا کام ہے ڈوبے رہیں عشقِ پیمبرؐ میں
محبت کو غذا تو روح کے اندر سے ملتی ہے

سچ تو یہ ہے کہ محمدؐ و اہلبیتِ محمدؐ کے بغیر نہ تو اس دنیا میں کامرانی عطا ہو سکتی ہے اور نہ آخرت میں نجات مل سکتی ہے۔ بقول سید اقبال حیدر:

علیؑ ہوں جس کے لیے میرِ کارواں اقبالؔ
پھر اس کو کون سا دھڑکا رہِ نجات میں ہے

سید اقبال حیدر نے بھی آلِ محمدؐ کا دامن مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔ انہوں نے یوں تو ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے تاہم ان کے جوہر مدحیہ اور رثائی شاعری میں کھل کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ حمد، نعت، منقبت، سلام، قصیدہ، نوحہ غرض ہر صنف میں اقبال حیدر نے اپنے بلیغ افکار و نظریات پیش کیے ہیں اور وہ خود اس پر نازاں بھی ہیں۔

مدح خوانِ علیؑ ہوں میں اقبالؔ
مرتبہ کوئی اس سے بڑھ کر ہے
سر جھکائے ہوں بابِ حیدرؑ پر
آسماں پر مرا مقدر ہے

سید اقبال حیدر کی درج ذیل کتب زیورِ طبع سے آراستہ و پیراستہ ہو کر صاحبانِ نقد و نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

۱۔ بے آب زمینیں
۲۔ اُمیدِ سحر
۳۔ الہام
۴۔ مرے دل کے آس پاس
۵۔ شبستانِ ولا
۶۔ قلم سے کالم تک

لطف کی بات یہ ہے کہ اپنے دیس میں رہنے والے ہمارے فنکار معاشرتی زبوں حالی کا رونا روتے رہتے ہیں اور جرمنی جیسے علاقے میں رہنے والے سید اقبال حیدر اُردو زبان و ادب کی ترویج کے لیے تمام ممکنہ ذرائع بروئے کار لاتے ہیں۔ ان کی بے پایاں علمی و ادبی خدمات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم انہیں جرمنی میں "پاکستان کا علمی و ادبی سفیر" قرار دے سکتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں قوتِ گویائی اور اصابتِ فکر عطا فرمائے تاکہ وہ آسمانِ ادب پر ایک روشن آفتاب بن کر جگمگاتے رہیں اور ان کی یہ دعا بارگاہِ ایزدی میں قبول ہو جائے۔

چمک رہے ہیں جس طرح مہ و نجوم و کہکشاں
مجھے بھی اک مقام دے مرا بھی اعتراف کر

سید اقبال حیدر کو رثائی ادب سے بے پناہ دلچسپی ہے۔ وہ سوز و سلام و نوحہ میں مہارت حاصل کرنے کے بعد اب صنفِ مرثیہ سے تعلقِ خاطر جوڑ رہے ہیں۔ ان کے درج ذیل دو مرثیے بہت جلد بڑی آب و تاب سے شائع ہو رہے ہیں۔

(ا) معرکۂ حق و باطل

(ب) اسلام اور حکومت

ان دونوں مرثیوں کے عمیق مطالعہ کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ اقبال حیدر نے اپنی شاعری کے جملہ محاسن کو ان مرثیوں میں سمونے کی شعوری کاوش کی ہے۔ ان مرثیوں میں غزل کا سوز و گداز، قصیدے کا طنطنہ، مثنوی کا پھیلاؤ، سلام کا ایجاز و اختصار، منقبت کی بلند فکری اور نعت کی عقیدت و احترام موجزن ہے۔ اس طرح یہ مرثیے محض اقبال حیدر کی عقیدت کا مظہر ہی نہیں بلکہ جملہ اصنافِ سخن کا پُرتجمل اظہار بھی ہیں۔ اب ذیل میں ان مرثیوں کے حوالے سے چند معروضات پیشِ خدمت ہیں۔

یہ بات انتہائی ملال انگیز ہے کہ ہمارے کج فہم اور بدبیں ناقدین ایک عرصہ تک مرثیے کو محض رونے رلانے کی چیز قرار دیتے رہے ہیں۔ اس طرزِ عمل نے مرثیہ کو فن سے دور

کر کے صرف اخروی ثواب تک محدود کر دیا۔ بھلا ہو ان ناقدین کا جنہوں نے اس صنفِ مرثیہ کو فن کی کسوٹی پر پرکھا اور اس ہشت پہلو صنف کے تمام رنگوں کو اُجاگر کرنے کی مشکور سعی کی۔ ان چشم معنی آشنا ناقدین کی کاوشوں کی بدولت آج مرثیوں کے ان اوصاف حمیدہ پر بھی ہماری نگاہ پڑ رہی ہے جو ایک عرصہ تک تعصبات کی دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ بیسویں صدی میں بطورِ خاص تمام اصناف کو ایک نئے تناظر میں پرکھنے کا رواج عام ہوا۔ اصناف کا رشتہ سماج سے جوڑا جانے لگا اور ان اصناف کو اہمیت دی جانے لگی جو ہماری سماجیات کو تبدیل کرنے پر قادر تھیں۔ اس صورتِ حال میں آل رضا، جوش ملیح آبادی، نجم آفندی، نسیم امروہوی، جمیل مظہری، قیصر بارہوی اور سید وحید الحسن ہاشمی نے مرثیے کے مزاج و مذاق کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی حتی المقدور کاوشیں کیں اور مرثیے کو اپنا خونِ جگر دے کر سب سے بڑی فتح کا نقارہ بنا دیا۔ بقول قیصر بارہوی۔

کربلا جس کی بلندی ہے وہ مینارہ ہے
مرثیہ سب سے بڑی فتح کا نقارہ ہے

سید اقبال حیدر بھی اسی روشن جادے کے راہرو ہیں انہوں نے اپنے مرثیوں کو محض عقیدت کا اظہار نہیں بننے دیا بلکہ ان میں سماجی رویوں کو شامل کر کے عہدِ جدید سے پیوست کر دیا ہے۔ اقبال حیدر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے جدت اور روایت دونوں کو دانائی سے آمیخت کر دیا ہے۔ آپ دیکھیے کہ انہوں نے ازل سے جاری حق و باطل کے معرکہ کو کتنی دانش مندی سے صرف ایک بند میں عہدِ حاضر سے جوڑ دیا ہے۔

اس دن سے آج تک حق و باطل میں جنگ ہے
ہر سمت نور و نار کی محفل میں جنگ ہے
حلقِ شہید و خنجرِ قاتل میں جنگ ہے
ہر قلب میں فشار ہے ہر دل میں جنگ ہے

کچھ لوگ اب بھی خالقِ اکبر کے ساتھ ہیں
کچھ منحرف ہیں خیر سے اور شر کے ساتھ ہیں

(مرثیہ۔ معرکۂ حق و باطل)

اقبال حیدر کے مرثیوں میں تلوار کے محامد اور گھوڑے کے محاسن تو شاید نہ مل سکیں لیکن ان میں زندگی بسر کرنے کے اعلیٰ تر اصول ضرور مل جائیں گے۔ ہمارے معاشرے میں اخلاقی قدروں کو جس طرح زوال آ رہا ہے۔ وہ صاحبانِ فہم و ذکا سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اقبال حیدر اس صورتِ حال سے کبیدہ خاطر ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اگر ہم معاشرے میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کا احیا چاہتے ہیں تو ہمیں سیرت محمدؐ و آلِ محمدؐ پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ہم آج بھی باطل کو صرف اور صرف سیرت رسولؐ اپنا کر ہی شکست دے سکتے ہیں۔ صرف ایک بند ملاحظہ فرمایئے:

چالیس سال سیرت و کردار سے لڑے
مکے میں صرف خُلق کی تلوار سے لڑے
یثرب میں آ کے لشکرِ کفار سے لڑے
یعنی ہر ایک ظالم و بدکار سے لڑے
شیطان جس میں رہتا تھا وہ دل مٹا دیے
سارے نشانِ سطوتِ باطل مٹا دیے

(مرثیہ۔ معرکۂ حق و باطل)

اقبال حیدر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم نے محمدؐ و آلِ محمدؐ سے اپنا ناتہ توڑ لیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم دنیا میں رسوا اور آخرت میں ذلیل ہو گئے۔ اس حوالے سے ان کے دو دردانگیز بند ملاحظہ فرمایئے:

کل اگر آلِ پیمبرؐ سے محبت ہوتی
کل اگر قوم کو قرآں سے عقیدت ہوتی
کل اگر پیروی سیرت و سنت ہوتی
کل اگر عزت و ایمان و شریعت ہوتی

آج اس طرح نہ رسوا سرِ عالم ہوتے
آج اقوام کے سردار فقط ہم ہوتے

ہم کو اللہ نے اسلام کی دولت دی تھی
اس کا احساں کہ محمدؐ کی نبوت دی تھی
حشر تک جو رہے قائم وہ شریعت دی تھی
ساتھ میں عترت و قراں کی قیادت دی تھی

اپنے سر گردشِ دوراں کی ہر آفت لے لی
ہم نے سب بیچ دیا اور حکومت لے لی

(مرثیہ: اسلام اور حکومت)

سید اقبال حیدر نے اپنے مرثیوں میں کوئی بڑا فلسفیانہ نظام حیات تو پیش نہیں کیا البتہ ہمارے لیے سوچ اور فکر کے نئے نئے در ضرور وا کیے ہیں۔ انہوں نے حق و باطل کی آویزش میں ہمیں تنہا نہیں چھوڑا بلکہ راہ ہدایت کا تعین کیا ہے اور آل محمدؐ کے جادے کو صراط مستقیم قرار دیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے کرب و بلا کو محض شہادت گاہ و امام عالی مقام ہی قرار نہیں دیا بلکہ کربلا کو عصر حاضر کے لیے ایک ہمہ گیر استعارہ بنا کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں صرف ایک بند ملاحظہ فرمایئے۔

کربلا درس گہہ اہلِ وفا آج بھی ہے
کربلا حق و صداقت کی صدا آج بھی ہے

کربلا دینِ پیمبرؐ کی بقا آج بھی ہے
کربلا عزتِ احکامِ خدا آج بھی ہے
کربلا اب بھی درخشندہ و تابندہ ہے
فیض اسی کا ہے کہ اسلام ابھی زندہ ہے

(مرثیہ: اسلام اور حکومت)

اقبال حیدر معاشرتی صورتِ حال سے انتہائی کبیدہ خاطر ہیں۔ وہ پردیس میں بیٹھ کر دیس کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال سے افسردہ ہو رہے ہیں۔ وہ جہاد کے نام پر ہونے والے فساد سے دل گرفتہ ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ چند دین ناشناس ملاؤں نے نوخیز ذہن رکھنے والوں کو شوقِ جنت کا اسیر بنا کر جہنم رسید کر دیا ہے۔ خودکش حملہ آوروں کا روپ دھارنے والے نہ تو اسلام کے دوست ہیں اور نہ پاکستان کے شیدائی۔ آپ اقبال حیدر کے درج ذیل بندوں کا مطالعہ فرمایئے اور ان کی ذہانت، فطانت اور عمیق نگاہی کی داد دیجیے۔

لوگ اسلام کے اب نام سے گھبراتے ہیں
داڑھی رکھے کوئی آتا ہے تو تھراتے ہیں
اہلِ ایماں جو ہیں ان باتوں پہ شرماتے ہیں
یہ جہاں چاہیں بلا خوف و خطر جاتے ہیں
کب بھلا اپنے بزرگوں سے یہ کم لاتے ہیں
وہ صنم لاتے تھے مسجد میں یہ بم لاتے ہیں

(مرثیہ: اسلام اور حکومت)

اقبال حیدر کا موقف یہ ہے کہ اسلام امن اور بھائی چارے کا پیغام دیتا ہے اور اس مذہب کی آرزو ہے کہ پوری دنیا میں شادکامی ہو اور ہر انسان خوش و خرم زندگی بسر کرے۔ یہ بات انتہائی ملال انگیز ہے کہ کچھ عاقبت نااندیشوں نے ظلم و جور کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ وہ خود

بھی دنیا میں ذلیل ہو رہے ہیں اور ہر صاحبِ دل پاکستانی کو بھی رسوا کر رہے ہیں۔ اقبال حیدر چشمِ تر سے یہ المناک مناظر دیکھ رہے ہیں اور اسے جہالت، بے یقینی، اسلامی تعلیمات سے دوری اور فرامین محمد و آلِ محمدؐ سے بے اعتنائی کا سبب گردانتے ہیں۔ ان کے مرثیے کا صرف ایک بند ملاحظہ فرمایئے اور ان کی دل گرفتگی کو محسوس کیجیے:

آج پھر دین ہے مشکل میں گھرا اے یارو
آج پھر ظلم کا طوفاں ہے چڑھا اے یارو
آج پھر مذہبِ حق پر ہے جفا اے یارو
آج پھر حشر ہے اک تازہ بپا اے یارو
آج پھر ظلم کی گھنگھور گھٹا چھائی ہے
آج پھر قصرِ یزیدی کی ہوا آئی ہے

(مرثیہ: اسلام اور حکومت)

میر انیس نے کہا تھا کہ "مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے" اقبال حیدر نے بھی اپنے مرثیوں میں حزن و ملال کی تمام کیفیات کو سلیقے سے جگہ دی ہے۔ ان کے پورے مرثیوں میں میرزا و بیر کی طرح حزنیہ رنگ تو نہیں چھایا ہوتا تاہم مرثیے کے آخری حصوں میں بکائیہ انداز اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ پتھر آنکھوں سے بھی اشک رواں ہو جاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اقبال حیدر مرثیہ میں غم پیدا کرنے کے ہنر سے آگاہ ہیں۔ کبھی تو وہ صورتِ حال سے غم کشید کرتے ہیں اور کبھی لفظ کے ذریعہ غم اُبھار دیتے ہیں۔ اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ کربلا خود ایک غم انگیز واقعہ ہے مگر اقبال حیدر کا کمال یہ ہے کہ وہ اس غم کو بھی ایک حرکی قوت کے طور پر استعمال کر کے پیغام رسانی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ آپ ان کے مرثیوں کے درج ذیل بند ملاحظہ فرمایئے اور ان میں موجود غم و الم کی مختلف کیفیات کو خود محسوس کیجیے۔

بین ہمشیر کے تھے اے مرے ماں جائے حسینؑ
بوند پانی دمِ آخر نہ ملا، وائے حسینؑ
میں تو زندہ رہی اور تو نہ رہا ہائے حسینؑ
تجھ کو ڈھونڈے کہاں اب تجھ کو کہاں پائے حسینؑ
ناؤ منجدھار میں ہے آ کے سنبھالو بھیا
پاس تم اپنے بہن کو بھی بلا لو بھیا

رو کے کہتی تھی سکینہؑ مرے پیارے بابا
اے مرے رنج و مصیبت کے سہارے بابا
چھوڑ کے مجھ کو کہاں آپ سدھارے بابا
کہیں ایسا نہ ہو دشمن مجھے مارے بابا
آپ واپس جو نہ آئے تو بہت روؤں گی
آپ کا سینہ نہ ہوگا تو کہاں سوؤں گی

(مرثیہ۔ اسلام اور حکومت)

اک تیر آ کے سینۂ پرنور پہ لگا
کھینچا جو اس کو خون کا پرنالہ بہہ گیا
نیزہ کسی کا پہلوئے اقدس پہ جب پڑا
گھوڑے سے فرشِ خاک پہ آئے شہِ ہدیٰ
تلواریں مارتے تھے بد اختر حسینؑ پر
چلتے تھے تیر و نیزہ و خنجر حسینؑ پر

تا وقتِ عصر ختم جو یہ معرکہ ہوا
محوِ نماز شہؑ تھے کہ محشر بپا ہوا

سجدے میں تھے کہ وعدۂ طفلی وفا ہوا
زہراؑ کا لال دین خدا پر فدا ہوا
خیمے میں جب اسے کسی صورت نہ کل پڑی
سر اپنا پیٹتی ہوئی زینبؑ نکل پڑی

(مرثیہ۔ معرکۂ حق و باطل)

سید اقبال حیدر مرثیے میں ایک جداگانہ اسلوب کے حامل ہیں۔ وہ نجم آفندی یا جوش ملیح آبادی کی طرح صاحب طرز مرثیہ نگار تو نہیں تاہم وہ اپنے افکار و نظریات کو سادہ اور عام فہم زبان میں پیش کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی باتوں کی طرح ان کا اسلوب بھی قارئین کے دلوں پر اپنے دیرپا اثرات مرتب کرتا ہے۔ وہ علم بیان و بدیع کے تمام اراکین کو مہارت سے استعمال کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اقبال حیدر شاعری میں فنی محاسن کے قائل تو ہیں لیکن وہ فن کے لیے اپنے افکار کو قربان کرنے پر مائل نہیں ہوتے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مرثیوں میں صنائع لفظی و معنوی نگینے کی طرح جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ ان کے مرثیوں کے درج ذیل بندوں کا مطالعہ فرمایئے اور ان میں موجود علم بیان و بدیع کے اراکین، روزمرہ محاورات اور تراکیب و مرکبات کا برمحل استعمال دیکھیے۔

آدمؑ کے بعد نوحؑ تھے اللہ کے سفیر
معصوم و پاک باز و اولوالعزم و بے نظیر
پیغام حق وہ لائے بے ہر جوان و پیر
تکذیب ان کی کرتے رہے قوم کے امیر
مشرک تھے جتنے دہر میں فی النار ہو گئے
کشتی میں جو سوار ہوئے پار ہو گئے

(صنعت تلمیح، صنعت تضاد، تراکیب و مرکبات، محاورہ)

(مرثیہ۔ معرکۂ حق و باطل)

ملک گیری کی تمنا کا یہ انعام ملا
علم سے منہ کو جو موڑا تو یہ پیغام ملا
ظلم و آزار کا جذبہ سحر و شام ملا
دامنِ آل جو چھوڑا تو یہ اسلام ملا
ننگِ تاریخِ جہاں ہو گئے وہ کام کیا
خود بھی رسوا ہوئے مذہب کو بھی بدنام کیا

(صنعت تضاد، تراکیب و مرکبات، محاورات)

(مرثیہ۔ اسلام اور حکومت)

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ عصرِ حاضر میں ہر فرد مضطرب ہے اور سکون کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اقبال حیدر نے اپنی شاعری اور خصوصاً مرثیوں کے ذریعہ اہلِ دانش و بینش کو یہ پیغام دیا ہے کہ اس دنیا میں سکون اور اطمینان کے متلاشیوں کو دامنِ محمدؐ و آلِ محمدؑ تھام لینا چاہیے۔ ان ذواتِ مقدسہ سے منسلک ہو جانے والوں کو دنیا و آخرت کی کامیابی اور کامرانی حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر ہم صدقِ دل کے ساتھ اقبال حیدر کے فکری سفینہ میں سوار ہو جائیں تو یقین واثق ہے کہ ہم ساحلِ مراد تک ضرور پہنچ جائیں گے کیوں کہ بقول نسیم امروہوی۔

اسے کیا خوفِ طوفاں ہو سفینہ جس کا وابستہ
بہتّر لنگروں سے اور چودہ بادبانوں سے

◆◆◆

◆◆◆

کچھ ڈاکٹر محمد ہارون قادر کے بارے میں

◆◆

یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ ہمارا رشتہ علم وحکمت کی عظیم ترین روایت سے منقطع ہو چکا ہے۔ ہم فنونِ لطیفہ کے ہر شعبہ میں روبہ زوال ہیں اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمیں اس زوال آمادگی کا احساس بھی نہیں ہے۔ شعروادب کے حوالے سے ہمارا رویہ بطورِ خاص انتہائی غیر سنجیدہ ہے۔ شعروادب کی مسند پر براجمان اصحاب مکرم ادب وشعر کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔ شاعر راتوں رات صاحبِ دیوان بننے کا متمنی ہے اور ادیب کم تر خیالات کے زور پر صاحبِ طرز ادیب کہلوانے کا خواہش مند ہے۔ اس صورتِ حال میں نقاد کا کردار بہت اہم ہو جاتا ہے تاہم افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے ناقدین بے بصیرت ہو چکے ہیں۔ وہ پڑھنے سے زیادہ لکھنے پر توجہ دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تنقیدی تحریروں میں یکسانیت آ گئی ہے۔ وہ ہر تخلیق کار کو "عظیم" اور "روایت ساز" ثابت کرنے میں اپنا زورِ قلم صرف کر رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ جب کسی معتبر نقاد کا لکھا ہوا تحسینی جملہ تخلیق کار کے لیے موجبِ طمانیت ہوا کرتا تھا اور آج یہ زمانہ ہے کہ کسی تخلیق کار پر لکھی ہوئی پوری کتاب بھی اس کے مرتبہ میں ذرہ بھر اضافہ نہیں کر پاتی۔ تنقید جیسے معتبر شعبہ کو بازیچۂ اطفال بنانے والے بے

بصیرت ناقدین اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ روزِ حشر انہیں اپنے لکھے ہوئے ایک ایک جملے کا حساب دینا ہوگا۔ ناقدین کی اس کج فہمی، بے بصیرتی اور غیر سنجیدگی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہماری عظیم ترین درس گاہوں میں اساتذہ کی ترجیحات تبدیل ہو چکی ہیں۔ اب ہر گھٹیا گائیڈ پر کسی نہ کسی عظیم استاد کا نام جگمگا رہا ہوتا ہے۔ اساتذہ صبح سے شام تک اپنی ترقیوں کی منصوبہ بندی میں مصروف ہوتے ہیں۔ دولت کی ہوس میں وہ کالج کے طالب علموں کو چھوڑ کر تدریس کے لیے طویل رخصت پر بیرون ملک روانہ ہو جاتے ہیں۔ بچے کھچے اساتذہ شام کو ٹیوشن پڑھانے کے لیے کنج عافیت میں پناہ لیتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں بے سہارا طلبہ و طالبات گائیڈوں کا سہارا لے کر امتحانات میں تو کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تربیت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ آج تربیت سے محروم یہی اساتذہ نسل سازی میں مصروف ہیں۔ یہ بات باعث امتنان ہے کہ اس ناگفتہ بہ صورت حال میں بھی بعض اساتذہ اپنے خونِ جگر سے علم و ادب کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔ وہ محنت، جانفشانی اور دل جمعی کے ساتھ تحقیق و تنقید کے سفر پر رواں دواں ہیں۔ انہیں نہ تو شہرت کی خواہش ہے اور نہ دنیاوی مال کی ہوس۔ وہ اپنی تخلیقات سے اپنے ہونے کا ثبوت فراہم کرتے رہتے ہیں۔ ان بے لوث اور سچی لگن رکھنے والے اصحاب میں سے ایک اہم نام **ڈاکٹر محمد ہارون قادر صاحب** کا بھی ہے جو تقریباً ربع صدی سے علم و ادب کی آبیاری کے لیے کوشاں ہیں۔ ان کی مطبوعہ تخلیقات ان کی علمی صلاحیت اور تحقیقی دیانت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ڈاکٹر محمد ہارون قادر کی تحقیقی بصیرت و تنقیدی بصارت سے کماحقہٗ آگاہ ہونے سے پیشتر ضروری ہے کہ ہم ان کے سوانحی کوائف اور علمی و ادبی سفر سے کماحقہٗ آگاہ ہو جائیں تاکہ ان کے فن کے تمام رخوں پر سیر حاصل محاکمہ ہو جائے۔ ذیل میں ان کے مختصر کوائف پیش خدمت ہیں:

❖ کوائف

- اصل نام — محمد ہارون قادر
- قلمی نام — ڈاکٹر محمد ہارون قادر
- ولادت — یکم اپریل ۱۹۵۷ء
- والد — شیخ غلام قادر
- والدہ — صالحہ مریم
- زوجہ — پروفیسر مسز شاہین ہارون
- اولاد — مہوش ہارون، ثنا ہارون، احمد مصطفےٰ ہارون

❖ تعلیم

- میٹرک — ۱۹۷۳ء — گورنمنٹ ہائی سکول چوہڑکانہ منڈی، ضلع شیخوپورہ
- ایف ایس سی — ۱۹۷۵ء — گورنمنٹ کالج، لاہور
- بی۔اے — ۱۹۷۷ء — گورنمنٹ کالج، لاہور
- ایم اے (تاریخ) — ۱۹۸۰ء — پنجاب یونیورسٹی، لاہور
- ایم۔اے (اردو) — ۱۹۸۲ء — اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور
- ایم۔فل (اردو) — ۱۹۸۸ء — علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
- پی ایچ۔ڈی (اردو) — ۲۰۰۶ء — جی۔سی یونیورسٹی، لاہور

❖ تدریسی مصروفیات

(ا) لیکچرار

- گورنمنٹ زمیندار سائنس کالج، جی ٹی روڈ، گجرات

(۳۰ نومبر ۱۹۸۲ء تا ۱۶ اپریل ۱۹۸۳ء)

- گورنمنٹ سرسید انٹر کالج، کٹاس ضلع جہلم

(۷ار اپریل ۱۹۸۴ء تا ۱۰ار اپریل ۱۹۸۵ء)

- گورنمنٹ زمیندار سائنس کالج، جی ٹی روڈ، گجرات

(۱۳ار اپریل ۱۹۸۵ء تا ۲۳ر ستمبر ۱۹۸۵ء)

- گورنمنٹ ڈگری کالج، شیخوپورہ

(۲۸ر ستمبر ۱۹۸۵ء تا ۲ر دسمبر ۱۹۸۷ء)

- گورنمنٹ کالج، لاہور

(۲ر دسمبر ۱۹۸۷ء تا ۲ار اپریل ۱۹۹۸ء)

(ب) اسسٹنٹ پروفیسر

- گورنمنٹ اسلامیہ سول لائنز، لاہور

(۲ار اپریل ۱۹۹۸ء تا ۱۰ر ستمبر ۱۹۹۹ء)

- گورنمنٹ کالج، لاہور

(۱۰ر ستمبر ۱۹۹۹ء تا ۵ر ستمبر ۲۰۰۶ء)

- جی سی یونیورسٹی، لاہور

(۶ر ستمبر ۲۰۰۶ء تا حال......)

❖ **تصانیف**

(ا) مطبوعہ

- راوی کالج نامہ (باشتراک) ۱۹۸۹ء
- قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری ۱۹۸۹ء
- خان احمد حسین خان۔ شخصیت اور فن ۲۰۱۰ء
- شبابِ اُردو کا تجزیاتی مطالعہ ۲۰۱۰ء

- کلیاتِ نظمِ آزاد (ترتیب و تدوین) ۲۰۱۰ء
- امجدِ تحقیق (باراوّل و دوم) ۲۰۱۰ء
- کلیاتِ اصغر (ترتیب و تقدیم) ۲۰۱۰ء

(ب) زیرِ طبع

- کلیاتِ نظمِ نذیر (ترتیب و تدوین)
- نسخۂ دلکشا۔ایک نادر تذکرہ (۱۸۷۰ء)

❖ متفرق تخلیقات

- مسلم کش فسادات، ماہنامہ اسلامی جمہوریہ،لاہور،۱۹۸۰ء
- اورینٹل کالج۔داستانِ عروج و زوال، ماہنامہ فنکار، لاہور، جون ۱۹۸۲ء
- عید الفطر، ماہنامہ فنکار، لاہور، جولائی/اگست ۱۹۸۲ء
- غیر متوقع جواب (افسانہ)، مرغزار، مجلہ جی سی شیخوپورہ، ۸۸۔۱۹۸۷ء
- شمس العلماء میر حسن، ماہنامہ قانون، لاہور، فروری ۱۹۸۸ء
- ساحر لدھیانوی کی شہرت کے عوامل، شام و سحر، لاہور، ۱۹۸۹ء
- سید انوار ظہوری (شاعری)، جدید ادب، لاہور، ستمبر ۱۹۸۹ء
- آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی، جدید ادب، لاہور، دسمبر ۱۹۸۹ء
- جھنگ ترنگ شاعر، شیر افضل جعفری، جدید ادب، لاہور، دسمبر ۱۹۸۹ء
- سیر الحیات ''قیصر بارہوی'' ماہنامہ شام و سحر، لاہور، جون ۱۹۹۰ء
- پروفیسر حق نواز کے نشریاتی ڈرامے، ماہنامہ شام و سحر، لاہور، جولائی ۱۹۹۱ء
- مفاہیم۔ایک مطالعہ، ماہنامہ شام و سحر لاہور، نومبر ۱۹۹۱ء
- طمع دے بندے (پنجابی ڈرامہ)، راوی، گورنمنٹ کالج لاہور، ۱۹۹۲ء
- شہاب نامہ (تجزیہ)، فاران، اسلامیہ کالج سول لائنز، لاہور، ۱۹۹۹ء

- قدیم اُردو میں پنجابی شعری روایت، تحقیق نامہ شعبۂ اُردو جی سی یونیورسٹی لاہور، ۲۰۰۳ء
- حالاتِ سعدی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، کاوش شعبۂ فارسی، جی سی یونیورسٹی لاہور، ۲۰۰۶ء
- خان احمد حسین خان کی ترجمہ نگاری، تخلیق مکرر، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۶ء
- موازنہ "بانگِ درا" و "آبِ بقا"، اقبال، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۶ء
- خان احمد حسین خان، مختصر تعارف، ماہِ نو، لاہور، ۲۰۰۶ء
- نئی شاعری (ایک تنقیدی مطالعہ)، راوی، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۶ء
- حفیظ ہوشیار پوری کی غزل گوئی، راوی، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۶ء
- خان احمد حسین خان کی ڈرامہ نگاری، راوی، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۷ء
- شبابِ اُردو۔ تعارفی خدوخال، تضمین، لاہور، مئی ۲۰۰۸ء
- تحقیق: اہمیت و ضرورت، تحقیق نامہ، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۹ء
- وحید قریشی کی زندگی کے آخری ایام، الحمرا، لاہور، دسمبر ۲۰۰۹ء
- مسجدِ قرطبہ کا فکری و فنی تجزیہ، اقبال، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۹ء
- تحقیق: اہمیت و ضرورت، ماہِ نو، لاہور، ۲۰۰۹ء
- سیرت احمدی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، انشاں صدی نمبر، دیال سنگھ کالج، لاہور، ۲۰۱۰ء
- فن ترجمہ نگاری اور اُردو زبان، اُردو نامہ، سہ ماہی مجلس زبان دفتر حکومت پنجاب، ۲۰۱۰ء

❖ نگران تحقیقی مقالہ جات

(ا) پی ایچ۔ ڈی

- راحت زہرا، حجاز کے سفرناموں کا تنقیدی جائزہ، ۲۰۱۰ء
- صفیہ مشتاق، اُردو مضمون نگاری کا ارتقاء، (زیرِ تکمیل)
- محمد احمد، اُردو افسانے میں عائلی زندگی، (زیرِ تکمیل)
- میاں غلام مصطفیٰ، خانوادہ گولڑہ شریف کی شعری خدمات، (زیرِ تکمیل)

(ب) ایم۔ فل

- فیض رسول، ماہنامہ 'نئی عبارت' کا توضیحی اشاریہ، ۲۰۰۳ء
- مبین رزاق، انفارمیشن ٹیکنالوجی اُردو زبان وادب اور تحقیق، ۲۰۰۴ء
- محمد اصغر، جدید مختصر مرثیہ اور وحید الحسن ہاشمی، ۲۰۰۶ء
- ابوسعید، ڈاکٹر خیال امروہوی کی ادبی خدمات، ۲۰۰۷ء
- عبدالرؤف، حزیں کاشمیری بطور شاعر، ۲۰۰۷ء
- نصیر احمد، راجہ رشید کی ادبی خدمات، ۲۰۰۷ء
- عارف کلیم، عدیم ہاشمی کی غزل، ۲۰۰۸ء
- محمد خالد فیاض، اُردو افسانے کے نمائندہ ناقدین، ۲۰۰۸ء
- عائشہ عظیم، اُردو ناول نگاری کا جائزہ (۱۹۹۵ء تا ۲۰۰۰ء)، ۲۰۰۹ء
- صدف اکرم، وحید الحسن ہاشمی کی غزل (زیر تکمیل)
- محمد عدنان، زبیدہ سلطانہ کی ناول نگاری (زیر تکمیل)
- محور عباس، داستانِ امیر حمزہ (زیر تکمیل)
- محمد عباس، حسن منظر کی افسانہ نگاری (زیر تکمیل)

(ج) ایم۔ اے

- صدف اکرم، ماہنامہ ''نعت'' کا توضیحی اشاریہ، ۲۰۰۶ء

❖ **گورنمنٹ کالج لاہور میں دیگر مصروفیات/اعزازات:**

- سیکرٹری UMC کمیٹی، شعبۂ امتحانات ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۸ء
- ممبر پراکٹوریل بورڈ ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۸ء
- ممبر کنڈکٹ برانچ ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۸ء
- اسسٹنٹ کنٹرولر امتحانات ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۸ء

- معاون نگران کوئز سوسائٹی ۱۹۹۵ء تا ۱۹۹۶ء
- نائب صدر ڈرامیٹک کلب ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۵ء
- معاون نگران مجلسِ مباحث ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۸ء
- ممبر ٹرائل کمیٹی برائے داخلہ ایف۔اے/ایف ایس سی
- ممبر انٹرویو کمیٹی برائے داخلہ ایف۔اے/ایف ایس سی
- ڈپٹی انچارج، این سی سی پروگرام ۱۹۹۷ء تا ۱۹۹۸ء
- سیکرٹری شعبۂ اُردو پنجابی ۱۹۹۵ء تا ۱۹۹۸ء
- نگران مجلس مباحث ۱۹۹۸ء تا حال
- ممبر ٹیکنیکل کمیٹی، شعبۂ اُردو/پنجابی
- ممبر کمیٹی پنجاب سٹوڈنٹ کنونشن ۲۰۰۵ء

❖ حج و عمرہ :

- سعادتِ عمرہ ۱۹۹۳ء
- سعادتِ حج ۱۹۹۷ء

❖ رابطہ :

- مکان نمبر ۲۵۲، بلاک جے ۲، جوہر ٹاؤن، لاہور

فون رہائش: ۰۴۲-۳۵۳۱۴۴۳۶/۷

موبائل: ۰۳۰۲-۳۳۳۰۳۴۵

ای میل: dr.haroonqadir@gmail.com

ڈاکٹر محمد ہارون قادر تحقیق و تنقید کے میدان کے شہسوار ہیں۔

''ابجدِ تحقیق'' کے عنوان سے ان کی باقاعدہ ایک کتاب معرضِ وجود میں آ چکی ہے جو ان کی

تحقیقی بصارت پر دال ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے تحقیق کی اہمیت، ضرورت اور عصرِ حاضر میں اس کے درست اور باقاعدہ استعمال کے طریقے اُجاگر کیے ہیں۔ ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری نے اس کتاب کے دیباچہ میں اس کتاب کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے محققین کے لیے حاجت روا قرار دیا ہے۔ معروف محقق اور نقاد ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس کتاب کی علمی اُفادیت اُجاگر کرتے ہوئے اس کے فلیپ پر رائے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"۱۹۰۰ء تک اُردو میں اصولِ تحقیق پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ تحقیقی اصولوں پر لے دے کے گنتی کے چند مقالات موجود تھے مگر اس وقت اُردو دنیا میں بلند پایہ محققین ادب کی ایک اچھی خاصی تعداد ضرور موجود تھی اور اب ہمارے اس زمانے تک آتے آتے صورتِ حال بدل گئی ہے۔ اب فنِ تحقیق پر بہت سی کتابیں تو دست یاب ہیں مگر اچھے محققین کی تعداد خوفناک حد تک مختصر ہوتی جا رہی ہے۔ ایک تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی کی جماعتوں میں تحقیق کی تدریس پر زور دیا جا رہا ہے جس سے طلبہ میں تحقیق سے دل چسپی بڑھ رہی ہے۔ اگرچہ اب اصولِ تحقیق پر کئی ایک معیاری کتب موجود ہیں مگر مبتدیانِ تحقیق کی رہنمائی کے لئے ایسی کتب کی کمی کو شدت سے محسوس کیا گیا ہے جو اُن کو آسان اسلوب اور سہل انداز میں تحقیق کے مسائل اور قواعد سمجھا سکیں۔ جی سی یونیورسٹی، لاہور کے استاد ڈاکٹر محمد ہارون قادر نے ایسی کتاب کی کمی اور ضرورت کو سنجیدگی سے محسوس کرتے ہوئے فنِ تحقیق پر ایک ایسا مونوگراف تیار کیا ہے جو دانش گاہوں کے طلبہ کے لیے مبادیاتِ تحقیق پر ایک رہنما تحقیق مینول (manual) کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے تحقیق کے پھیلے ہوئے اور دقیق موضوعات کو

اختصار کے ساتھ سمیٹا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کا یہ کام نو آموز محققوں
کے لیے مفید ثابت ہوگا۔''

(تبسم کاشمیری، ڈاکٹر (فلیپ)، ابجدِ تحقیق، مصنف: ڈاکٹر ہارون قادر، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)

یاد رہے کہ حال ہی میں ''ابجدِ تحقیق'' کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔ جو اس کتاب کی مقبولیت اور افادیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر ہارون قادر کی تنقید و تحقیق کا حسین امتزاج ان کی کتاب ''قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری'' میں کھل کر ہمارے سامنے آیا۔ اس کتاب کو موصوف نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا اور قیصر بارہوی اور اردو مرثیے کے حوالے سے گراں قدر معلومات فراہم کیں۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر آغا سہیل نے ہارون قادر کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا اعتراف کیا اور اس کتاب کو قیصر شناسی کے حوالے سے ایک معروضی مطالعہ قرار دیا۔ ہارون قادر نے اس مستند دستاویز میں قیصر بارہوی کی شخصیت، جدید اردو مرثیے کے بدلتے ہوئے رجحانات اور اُردو مرثیے میں قیصر بارہوی کی خدمات کا احاطہ انتہائی سلیقے اور دیانتداری سے کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ناقدین نے قیصر بارہوی کی شخصیت اور فن کی مکمل تفہیم کے لیے اس کتاب کو ایک گراں قدر دستاویز قرار دیا ہے۔ اس کتاب کی پشت پر رائے دیتے ہوئے راقم الحروف نے تحریر کیا تھا کہ :

''پروفیسر محمد ہارون قادر ایک فاضل استاد کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین معتبر رسائل اور جرائد میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر اہلِ دانش و بینش سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا تحقیقی اور تنقیدی شعور انہیں معروف نقادوں کے حلقے میں لے آتا ہے۔

بیسویں صدی میں صنفِ مرثیہ نے بے حد ترقی کی ہے۔ جوشؔ، آلِ رضا، نسیم امروہوی، صفدر حسین، جمیل مظہری، وحید الحسن ہاشمی اور قیصر

بارہوی نے اس صنف کو موضوعی اور فکری اعتبار سے استحکام بخشا۔ قیصر بارہوی کا اختصاصی پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اس صنف کو مخصوص ماحول سے نکال کر عوامی اجتماعات تک پہنچایا اور اس صنف کو مظلوم و مجبور عوام کے جذبات و احساسات کا آئینہ دار بنایا۔

پروفیسر محمد ہارون قادر نے زیرِ نظر تصنیف میں نہایت محنت اور جانفشانی سے اردو مرثیے کی تاریخ کو سامنے رکھ کر قیصر بارہوی کے کلام میں جدت و انفرادیت کا سراغ لگایا ہے۔ قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری پر یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ جس میں ان کے مرثیوں کی تمام جہتیں سمٹ آئی ہیں۔''

(شبیہ الحسن، ڈاکٹر (فلیپ)، قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری، مصنف: ڈاکٹر ہارون قادر، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)

ڈاکٹر ہارون قادر تحقیق کے رسیا ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے بیسویں صدی کے ایک گم شدہ مگر صاحب کمال تخلیق کار خان احمد حسین خان کو زمانے کی گرد سے جھاڑ کر صاحبانِ فہم و فراست کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ حال ہی میں ان کی کتاب ''خان احمد حسین خان۔ فن اور شخصیت'' شائع ہو کر صاحبانِ دانش سے داد وصول کر رہی ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں ڈاکٹر سعادت سعید نے واضح کیا ہے کہ ڈاکٹر ہارون قادر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو کے ایک گمشدہ ادیب کو گردشِ زمانہ سے بازیاب کرایا ہے اور بڑے متوازن انداز میں دادِ تحقیق دی ہے۔ اس کتاب کو ڈاکٹر ہارون قادر نے سات ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر باب کو جدید تحقیقی تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی بلیغ سعی کی ہے۔ ان کا سب سے بڑا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے اپنے موضوع کے ساتھ بھرپور ہمدردی کا اظہار کیا ہے لیکن کہیں بھی افراط و تفریط سے کام نہیں لیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ خان احمد حسین خان خوش نصیب تھے کہ ان پر ڈاکٹر ہارون قادر جیسے محنتی اور صالح محقق و نقاد کی نظر پڑ گئی اور انہوں نے ان کی شخصیت اور فن کے تمام

پہلوؤں کو اُجاگر کر کے عصرِ حاضر کے ناقدین محققین کو ششدر کر دیا۔ اس کتاب کے فلیپ پر لکھی گئی ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی بیش قیمت رائے ہمارے مؤقف کی تائید کرے گی:

''خان احمد حسین خان ان چند نامور ادیبوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں جنھوں نے پنجاب میں اُردو زبان و ادب کی پیش رفت کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ بیک وقت شاعر، ڈراما نگار، افسانہ و ناول نویس اور مترجم تھے۔ ان تھک لکھنے والے تھے اور نصف صد سے زیادہ کتابوں کے خالق تھے۔ اس کے علاوہ ایک ادبی ماہنامہ 'شبابِ اردو' بیس سال تک باقاعدگی سے شائع کرتے رہے۔ ان کی تصانیف اور ماہنامہ 'شبابِ اُردو' اپنے دور میں ہر کہ و مہ سے خراجِ تحسین حاصل کیا کرتے تھے۔ اس بات کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے کہ کچھ لوگ اپنے عہد کے مشاہیر میں شامل ہوتے ہیں مگر چند دہائیاں گزرنے کے بعد گردِ گمنامی میں کیوں چھپ جاتے ہیں؟ میرے نزدیک اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کی تصانیف کو اُجاگر کرنے کے لیے محقق اور نقاد ان کی طرف توجہ مبذول نہیں کرتے۔ خان احمد حسین خان کو ان کی وفات کے نصف صدی بعد بالآخر ڈاکٹر محمد ہارون قادر کی صورت میں ایک محقق اور نقاد مل گیا ہے۔ جس نے اپنے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کے لیے ان کی شخصیت اور فن کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے بڑی توجہ، جستجو اور محنت سے موضوعِ مقالہ کی حیات اور تصانیف کے بارے میں ریزہ ریزہ معلومات اکٹھی کی ہیں۔ پھر انھیں بڑی دیدہ ریزی سے یکجا کیا ہے اور یوں ایک ایسا دل نشیں مرقع تیار کیا ہے جو خان احمد حسین خان کے بارے میں جامع معلومات مہیا کرتا ہے اور ان کے ادبی مقام کا بھی عمدگی سے تعین کرتا ہے۔ جی سی یونیورسٹی، لاہور سے پہلی پی ایچ

ڈی کا اعزاز حاصل کرنے والا یہ مقالہ اس بنا پر خصوصی اہمیت رکھتا
ہے کہ جب کبھی خطۂ پنجاب میں اردو ادب کی خدمات کا جائزہ لیا جائے
گا تو خان احمد حسین خان کے نام اور کام کو نمایاں حیثیت دی جائے گی
اور ڈاکٹر محمد ہارون قادر کا یہ تحقیقی کام اس سلسلے میں بنیادی ماخذ کا کام
دے گا۔''

(خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر (فلیپ)، خان احمد حسین خان۔ فن اور شخصیت، مصنف: ڈاکٹر ہارون قادر، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)

ڈاکٹر محمد ہارون قادر کی تحقیق و تنقید کا ایک اہم نمونہ ان کی تازہ کتاب ''شبابِ اردو۔ تجزیاتی مطالعہ'' ہے۔ ''شبابِ اردو'' خان احمد حسین خان کا ایک ادبی مجلہ تھا جو تقریباً بیس برس تک علم و ادب کی خدمت کرتا رہا۔ اس رسالے کے ذریعہ جہاں ایک جانب علم و ادب کے نئے دریچے وا ہوئے وہاں دوسری جانب اس نے ہم عصر رسائل کی طرح نئے لکھنے والوں کی ایک کھیپ تیار کی۔ ڈاکٹر ہارون قادر نے اس کتاب میں ''شبابِ اردو'' کی افادیت پر روشنی ڈالی ہے اور اس کا تحقیقی اشاریہ بھی مرتب کر دیا ہے۔ اس کتاب کے وسیلے سے ہم بیسویں صدی کی ادبی صورت حال سے بھی روشناس ہو جاتے ہیں اور ''شبابِ اردو'' میں شائع ہونے والے تخلیق کاروں اور موضوعات سے بھی کماحقہٗ آگاہ ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر خان محمد اشرف خان نے اس کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر ہارون قادر کو ایک منجھا ہوا محقق اور اس کتاب کو اردو ادب کی تاریخ میں ایک عمدہ اضافہ قرار دیا ہے۔ اس کتاب میں ''حرفے چند'' کے عنوان سے پروفیسر محمد احمد خان نے خان احمد حسین خان کو ایک کثیر الجہتی تخلیق کار اور ان کے رسالے ''شبابِ اردو'' کو ایک اہم ادبی کارنامہ قرار دیا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ڈاکٹر ہارون قادر کا اس رسالے کی خدمات کا تجزیاتی مطالعہ کرنا تحقیق و تنقید ہر دو اعتبار سے مفید اور قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر طارق زیدی نے اس کتاب کے فلیپ پر تحریر کیا ہے کہ ڈاکٹر ہارون قادر کی یہ تصنیف سنجیدہ فکری اور دماغ سوزی کا نتیجہ ہے لہٰذا اس کی ترتیب و تسوید میں ان کی محنت اور جانفشانی کے اثرات نمایاں ہیں۔

ڈاکٹر ہارون قادر نے ایک مرتب اور مدون کے طور پر بھی اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ اقلیمِ ادب میں عام طور پر تدوین کار اور مرتب کو کم حیثیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مرتب محض اِدھر اُدھر کی چیزوں کو یکجا کر کے قارئین کے سامنے پیش کر کے اپنی جان چھڑا لیتا ہے۔ یہ تصور انتہائی غیر سنجیدہ اور غلط ہے۔ مرتب کا اولین فرض ایک محقق کی طرح چیزوں کی بازیافت ہے۔ پھر وہ ایک نقاد کی طرح دستیاب مواد کو میزانِ عقل پر تولتا ہے اور پھر کتابی شکل میں قارئین کی نذر کرتا ہے۔ دوسرے معنوں میں یوں کہہ لیجیے کہ ایک اچھا تدوین کار یا معیاری مرتب بیک وقت محقق اور نقاد کی صفات سے مالا مال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ہارون قادر ایک صالح تدوین کار ہیں۔ انہوں نے مولانا محمد حسین آزاد کے مطبوعہ و غیر مدون کلام کو ''کلیاتِ نظمِ آزاد'' کے عنوان سے ترتیب دے کر ایک وقیع علمی ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ اس کتاب میں آزاد کی غزلیات، مثنویات، قصائد اور متفرق کلام موجود ہے اور آخر میں ضمیمہ جات کی موجودگی نے اس کی اہمیت دوچند کر دی ہے۔ ''حرفِ چند'' کے عنوان سے لکھے گئے اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں معروف نقاد خالد علیم نے واضح کیا ہے کہ آزاد کے اس کلام کی تدوین تو ایک اہم ادبی ضرورت کو پورا کرتی ہے اور ڈاکٹر ہارون قادر نے اسے حسنِ تدوین سے آراستہ کر کے اردو دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ یہاں یہ بات محلِ نظر رہے کہ ڈاکٹر ہارون قادر نے اس کتاب میں محض آزاد کا کلام ہی یکجا نہیں کر دیا بلکہ انہوں نے تحقیق و تدوین کے جملہ تقاضوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے حواشی اور تعلیقات کے ذریعہ بعض اہم مباحث پر روشنی ڈالی ہے اور بعض مقامات پر متن کے اختلافات کو ظاہر کر کے ان کو رائج املا میں پیش بھی کر دیا ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے ذریعہ محمد حسین آزاد کے کلام کو درست متن کے ساتھ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے اور اس کی جتنی بھی مدح سرائی کی جائے کم ہے۔ بعض غیر مطبوعہ تخلیقات کی پیش کش نے اس کتاب کے حسن و معیار کو مزید دوچند کر دیا ہے۔

اس کتاب کے حوالے سے معروف محقق ڈاکٹر وحید قریشی فلیپ پر رقمطراز ہیں:

''مولانا محمد حسین آزاد کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد نئے ادب کی جو بنیادیں استوار ہوئیں اور جن اساطینِ ادب نے ادبی عمارت کی ساخت میں نمایاں کردار ادا کیا، ان میں مولانا آزاد کو امتیاز حاصل ہے۔ بعض امور میں اختلاف کے باوجود مولانا الطاف حسین حالی ایک ادبی ڈکٹیٹر کی حیثیت سے اپنے تنقیدی نظریات کو تسلیم کروا لیتے ہیں تو ''نیرنگِ خیال'' میں مولانا آزاد کی نثری جلوہ سامانی اور ''آبِ حیات'' کے منفرد اسلوب کی دل کشی ہمارے ادب کے گراں بہا سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ آزاد کا نثری اسلوب آزادی کا حصہ ہے اور اس میں کوئی اُن کا حریف نہیں۔ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ انھوں نے اردو ادب پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

دل چسپ پہلو یہ ہے کہ آزاد نے اپنے استاد ذوق دہلوی کے دیوان کو مرتب کیا تو استاد کی محبت میں اُن کی اپنی شاعری کا جوہر بھی مزید چمک اُٹھا اور اس میں کہیں کہیں اُن کی تخلیقی صلاحیت کا پہلو ''مستزاد'' ہو گیا۔ ڈاکٹر ہارون قادر شاعر نہیں بلکہ ایک نقاد، محقق اور اردو ادب کے استاد ہیں۔ جدید اردو دُنیا اب تک آزاد کی جدید نظموں سے آشنا تھی، اس کلیات سے اُن کی غزل گوئی اور قصیدہ نگاری کا جوہر بھی کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ میں اس کلیات کا صدقِ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں کہ انھوں نے آزاد کے کلام کو یکجا ہی نہیں کیا بلکہ اس سلسلے میں آئندہ تحقیق کی سمت نمائی کا فریضہ بھی سرانجام دیا ہے۔''

(وحید قریشی، ڈاکٹر (فلیپ)، کلیاتِ نظم آزاد، مصنف: ڈاکٹر ہارون قادر، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)

ڈاکٹر ہارون قادر کا ایک اور قابلِ قدر کارنامہ بیسویں صدی کے ایک اہم شاعر

اصغر حسین اصغر گونڈوی کے کلام کو "کلیاتِ اصغر" کے نام سے ترتیب دینا ہے۔ موصوف نے دوسرے سہل نگار مرتبین کی طرح محض اصغر گونڈوی کے مجموعوں کو یکجا کر کے کلیات کی شکل نہیں دے دی ہے بلکہ ان کی غزلیات کی ردیف وار تدوین کی ہے اور حواشی اور ضمیمہ جات کے ذریعہ ان کی معنویت میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں خالد علیم نے ''کلیاتِ اصغر جدید ایڈیشن'' میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اصغر گونڈوی کے دستیاب مجموعوں میں یہ نسخہ سب سے بہتر ہے اور تحقیقی معیارات کو ملحوظ رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ہارون قادر کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کلیاتِ اصغر مرتب کر کے عصرِ حاضر کے ناقدین کو نظم نگاروں کے مقابلے میں ایک اچھے غزل گو شاعر سے متعارف کرایا ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے معروف نقاد ڈاکٹر شفیق عجمی فلیپ پر رقمطراز ہیں:

> ''ڈاکٹر محمد ہارون قادر کی تحقیقی و تالیفی کاوشوں کی فہرست، موضوعاتی تنوع کی آئینہ دار ہے۔ اُنھوں نے کسی ایک شعبے کو اپنی تحقیقی دلچسپیوں کا مرکز بنانے سے گریز کرتے ہوئے شخصیت شناسی، اصول تحقیق اور ترتیب و تدوین کے علاوہ دیگر موضوعات پر قلم اُٹھا کر اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے اور اہلِ علم سے اس کی داد بھی پائی ہے۔
>
> آج جبکہ انسان تعصب، تخریب اور انتہا پسندی کے ہاتھوں پامال ہو رہا ہے ''کلیاتِ اصغر گونڈوی'' کی ترتیب و اشاعت تو کو انسان دوست، عظمت انسانی اور سچی روحانیت کے فروغ کا راست پیغام سمجھا جانا چاہیے''

(شفیق عجمی، ڈاکٹر (فلیپ)، کلیاتِ اصغر ،مصنف: ڈاکٹر ہارون قادر، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)

ڈاکٹر ہارون قادر ایک سنجیدہ فکر محقق، نقاد اور تدوین کار ہیں۔ انہوں نے آہستہ روی کے ساتھ اپنے علمی و ادبی کارنامے باشعور قارئین کی خدمت میں پیش کیے ہیں۔ اگر ہم ان کی تخلیقات کا مطالعہ کریں تو اس میں ایک بالغ نظر محقق اور باشعور نقاد کی جملہ صلاحیتیں جلوہ گر ہیں۔ انہوں نے تحقیق، تنقید اور تدوین کو شہرت کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ

جلب منفعت سے دور رہتے ہوئے علم و ادب کی آبیاری کے لیے اپنی جملہ تخلیقی صلاحیتیں وقف کر دی ہیں۔ ان کی نگرانی میں ایم۔اے، ایم فل اور پی ایچ۔ڈی کے تحقیقی و تنقیدی مقالات لکھنے والے بیسیوں طلبہ و طالبات علم و ادب کے میدان میں اپنے ذی وقار استاد کا نام روشن کرنے میں مصروف ہیں۔ اب یہ بات بلا شک و بلا تردد کہی جا سکتی ہے کہ اگر ڈاکٹر محمد ہارون قادر دنیاوی حرص و آز سے دور رہ کر اسی دلجمعی اور دیانتداری سے تحقیق، تنقید اور تدوین کے میدان میں طبع آزمائی کرتے رہے تو بہت جلد وہ شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں بلند ترین منصب پر فائز ہو جائیں گے۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ عصرِ حاضر میں ہم نے فنونِ لطیفہ سے اپنا تعلق خاطر توڑ لیا ہے اور اسی باعث مسلسل روبہ زوال ہونا ہمارا مقدر بن چکا ہے۔ اس ناگفتہ صورتِ حال میں بھی بعض ''سر پھرے'' تخلیق کار ایسے بھی ہیں جنہوں نے دنیاوی عزت و شہرت سے لاتعلق ہو کر علم و ادب کی آبیاری کو اپنا اولین فرض گردان لیا ہے۔ ڈاکٹر محمد ہارون قادر بھی ان چنیدہ تخلیق کاروں میں شمار کیے جا سکتے ہیں جو تقریباً ربع صدی سے چراغ علم و ادب کی لو کو اپنے خونِ جگر سے فروزاں کیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے محض اپنی گراں قدر تخلیقات کے ذریعہ ہی شعر و ادب کا دامن موتیوں سے نہیں بھرا ہے بلکہ ان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے اردگرد ایسا علمی و ادبی ماحول تخلیق کر لیا ہے کہ ان کے تلامذہ بھی اسی جادہ پر گامزن ہو گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آنے والا زمانہ جب محنتی، مستعد، دیانتدار، بے لوث اور بالغ نظر ناقدین اور محققین کی فہرست ترتیب دے گا تو ڈاکٹر محمد ہارون قادر کا نام سرِ فہرست جگمگا رہا ہوگا۔

سچ ہے میرا حرف حرف اور جس کو اس میں شک ہے آج
دیکھ لینا کل وہ میرا ہم زباں ہو جائے گا

◆◆◆

عرفی ہاشمی کے جدید مختصر مرثیے

اُردو مرثیہ ایک مرکب صنف سخن ہے۔ یہی سبب ہے کہ مرثیے کے میدان میں صرف وہی شاعر قدم رکھ سکتا ہے جسے ایک جانب توفیق ایزدی ہو اور دوسری جانب اسے جملہ اصناف سخن پر مہارت حاصل ہو۔ ہمارے قدیم ناقدین کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے صنف مرثیہ پر تنقید کرتے ہوئے اسے انیس و دبیر پر ختم کر دیا اور شعرا میں یہ احساس اُجاگر کر دیا کہ اب مرثیے کے لیے کوئی موضوع باقی نہیں رہا۔ اس طرز عمل کا منفی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جدید شاعروں نے مرثیے سے لاتعلقی کا اظہار کیا اور نوجوان شعرا تو اس صنف شاعری سے احتراز کرنے لگے۔ یہ امر باعث امتنان ہے کہ جدید مختصر مرثیے کے پیش رو اُستاد الشعرا سید وحید الحسن ہاشمی نے نوجوان شعرا کو اس صنف سے رغبت دلائی۔ ان کی تحریک پر جن نوجوان شعرا نے اس کوچے میں قدم رکھا ان میں عرفی ہاشمی بھی شامل ہیں۔

عرفی ہاشمی جدید لب و لہجہ کے شاعر ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی کے شعبہ سے انسلاک کے باعث وہ شعر و ادب کو جدید تناظر میں سمجھنے اور پرکھنے کے عادی ہیں۔ آپ ان کی غزلوں، نظموں، سلاموں اور مرثیوں کا مطالعہ فرمالیجئے، آپ دیکھیں گے کہ وہ ایک خاص نقطۂ نظر کے حامل ہیں اور انہوں نے شاعری میں اپنا ایک الگ نظام فکر وضع کیا

ہے۔ ان کی شاعری میں روحِ عصر بھی موجود ہے اور ان کے افکار و نظریات اکیسویں صدی کے تناظر میں ایک خاص معنی مرتب کرتے ہیں۔ یہ امر انتہائی حیرت انگیز ہے کہ انہوں نے کم عمری میں صنفِ مرثیہ سے تعلقِ خاطر جوڑا ہے۔ آپ ان کے مرثیوں کا مطالعہ فرما لیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان مرثیوں میں کلاسیکی ہیئت تو موجود ہے لیکن ان کا مجموعی مزاج و مذاق جدید شاعری کی دین ہے۔ عرفی ہاشمی کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے مرثیے کے پرانے سبو میں تازہ مے ڈال دی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مرثیے علم و ادب کے شیدائیوں کے لیے دعوتِ فکر کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

سید عرفی ہاشمی محض ایک روایتی مرثیہ نگار ہی نہیں ہیں بلکہ انہوں نے عصرِ حاضر میں رثائی ادب کی اہمیت اور افادیت کو سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت کا احساس بھی دلایا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

"——اس حقیقت سے انحراف ممکن نہیں کہ عالمی ادب، پاکستانی ادب اور پاکستانی ادب میں رثائی ادب کے قارئین کی تعداد روز بروز کم ہو رہی ہے۔ مجھے اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ ہمارے تہذیبی تشخص کی بنیاد اب شعر و ادب پر نہیں بلکہ معیشت اور ٹیکنالوجی پر استوار ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایک طرف بین الاقوامی، قومی اور علاقائی کلچر اور دوسری جانب شخصیت کو تشکیل دینے والے بنیادی رجحانات کے پیچھے بھی یہی دو عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔ نوے فیصد سے زیادہ افراد پہلے ہی اس بات کے قائل ہیں کہ معیشت و ٹیکنالوجی سے تعلقِ خاطر نہ رکھنے پر انہیں سماجی حیثیت اور مادی فوائد کے حصول میں شدید رکاوٹیں درپیش ہیں۔ اب سوچنا یہ ہے کہ پاکستانی ادب اور پاکستانی ادب میں رثائی ادب کس کے لیے تخلیق کیا جائے؟ "ادب برائے زندگی" کا فلسفہ اچھا ہے مگر روزمرہ کاروبارِ حیات میں کہیں اس کی عملی شکل نظر نہیں آتی۔

''ادب برائے ادب'' کا نظریہ بھی مشکل سے دوچار ہے کہ قارئین آپ کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں اور نئی نسل ان کے اس عمل کو احسن گردان رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس صورتحال میں ہم ''ادب برائے ادیب'' کے نظریے کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں------''

(عرفی ہاشمی بجھے چراغوں کی روشنی' لاہور الحسن پبلی کیشنز بار دوم ۲۰۰۵ ص ۸)

عصرِ حاضر میں ادب پر ایک زبوں حالی کی کیفیت طاری ہے۔ دوسرے اصناف کی طرح مرثیہ بھی ناقدین وقارئین کی بے حسی کا شکار ہوتا جارہا ہے۔ اس صورت حال میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح مرثیے کے زندہ رہنے کے اسباب فراہم کریں۔ اس سلسلے میں عرفی ہاشمی کا موقف بھی سنتے چلیے جوان کے جدید طرز احساس کا علمبردار ہے:۔

''۔۔۔۔مرثیہ بنیادی طور پر ایک Message ہے۔ ہر Message کے اپنے سامعین (Audience) ہوتے ہیں جن کے لیے اُسے تخلیق کیا جاتا ہے۔ آپ کے اس Message (مرثیہ) کے سامعین میں اگر کمی واقع ہو رہی ہو تو مرثیے کو زندہ رکھنے کیلئے درج ذیل اقدامات کی ضرورت ہے۔ اولاً میڈیا کے ذریعے اپنے سامعین کو اپنے Message (مرثیہ) کی اہمیت کا احساس دلا کر ان کا ذوق وشوق بڑھانے کی سعی کی جائے۔ ثانیاً تکنیکی مہارت اور تربیت کے ذریعے ان میں Message (مرثیہ) کو سمجھنے اور اُس کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت بیدار کی جائے۔ ثالثاً Message (مرثیہ) کی ساخت اور اسلوب کو Audience کے عہد کے مطابق تبدیل کر دیا جائے۔ یہ نکتہ مرثیے میں جدّت اور اختصار کا جواز بھی ہے۔ ربعاً مرثیے میں کربلا کو اکیسویں صدی کے تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی شعوری سطح پر کوشش کی جائے۔

Message یا Audience Development
Diversification کے بغیر جدید مرثیے کی نمو ناممکن ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ مرثیے کے احیا اور فروغ و اشاعت کی اس نسبتاً پیچیدہ صورتحال کو سمجھا جائے اور اپنی انفرادی اور اجتماعی کاوشوں کو مربوط اور بامقصد کر کے کسی جدید پلیٹ فارم یا تحریک کی تشکیل کی جائے ورنہ ان مشکل حالات کے تناظر میں اگلے پچاس سال تک عوامی اور حکومتی سطح پر پاکستانی ادب کو بالعموم اور رثائی ادب کو بالخصوص کوئی پذیرائی ملتی نظر نہیں آتی——"

(عرفی ہاشمی بجھے چراغوں کی روشنی' لاہور الحسن پبلی کیشنز بار دوم ۲۰۰۵ ص ۹)

سید عرفی ھاشمی نے یوں تو ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن ان کے طبعی جوہر کا بھرپور اظہار مرثیوں میں ہمارے سامنے آیا ہے۔انہوں نے مجموعی طور پر ابھی تک درج ذیل چار مرثیے تخلیق کیے ہیں تاہم ان کا مرثیاتی سفر جاری ہے۔

پہلا مرثیہ

الف)	نام مرثیہ	میزان خرد
ب)	سن تخلیق	۱۹۹۹ء
ج)	کل بند	۵۹
د)	مطلع	محو حیرت ہوں خرد کے ارتقا کو دیکھ کر
ر)	موضوع	عقل و دانش کے ارتقائی سفر کا حال اور حضرت حرؑ کی شہادت عظمیٰ

دوسرا مرثیہ

الف)	نام مرثیہ	سیاست تبسم
ب)	سن تخلیق	۲۰۰۱ء

ج) کل بند ۵۳

د) مطلع بارغ افکار کے پھولوں کی مہک زخمی ہے

ر) موضوع عصر حاضر کی ابتر کیفیات کا ذکر اور شہادت حضرت علی اصغرؑ کے اثرات

تیسرا مرثیہ

ا) نام مرثیہ محنت اور ادیب

ب) سن تخلیق ۲۰۰۲ء

ج) کل بند ۵۲

د) مطلع اکیسویں صدی کا تعارف عجیب ہے

ر) موضوع اکیسویں صدی میں ادب اور ادیبوں کی حالت زار اور شہدائے کربلا کی بے مثال قربانیوں کا ذکر

چوتھا مرثیہ

ا) نام مرثیہ اکیسویں صدی اور کربلا

ب) سن تخلیق ۲۰۰۳

ج) کل بند ۴۷

د) مطلع محورِ تشکیک سے ہٹ کر یقیں کی بات ہو

ر) موضوع اکیسویں صدی میں معاشرتی مسائل و معاملات اور احوال شب عاشور

عرفی ہاشمی کے درج بالا چاروں مرثیوں کے عنوانات پڑھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ شعر و ادب کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ ان کے یہ

چاروں مرثیے ''بجھے چراغوں کی روشنی'' کے علامتی عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔اب ان چاروں مرثیوں کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

(ا) میزان خرد

''میزان خرد'' نامی مرثیہ ۱۹۹۹ء میں معرض وجود میں آیا اور ۲۰۰۵ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔اس مرثیے میں کل ۵۹ بند ہیں۔

''میزان خرد'' حضرت امام حسینؑ کے ایک جاں نثار ساتھی حضرت حرؓ کی شہادت عظمیٰ کے حوالے سے معرض تخلیق میں آیا ہے۔مرثیے کے آغاز میں شاعر نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ عصر حاضر میں انسان جس ترقی کو دیکھ کر ورطۂ حیرت میں پڑ گیا ہے وہ تو ابھی انسانی ترقی کا آغاز ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان آئندہ زندگی کے تمام امکانات کو دانش و برہان کے ذریعہ پرکھے۔شاعر کا موقف یہ ہے کہ عقل کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہے کیونکہ عقل مستقبل پر نظر کرتی ہوئی پر ضیا تہذیب کی ہر رہگزر پہ سفر کرتی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ عقل کتنی صدیوں سے رواں ہے اور پھر بھی اس کے ماتھے پہ کوئی شکن موجود نہیں ہے۔شاعر احساس دلاتا ہے کہ آنے والے زمانے میں عقل کے ذریعہ ہر ناممکن کو ممکن بنایا جا سکے گا۔

سینۂ مہتاب پہ نقش قدم انسان کا
ہو کے سرشار تفاخر دے رہا ہے یہ صدا
اک قمر کافی نہیں ہے میری محنت کا صلہ
جتنے اجرام فلک ہیں اب یہ سن لیں برملا
عین ممکن ہے خلا ہو فتح شہروں کی طرح
سارے سیارے گنوں میں گھر کے کمروں کی طرح

عرفی ہاشمی کا موقف یہ ہے کہ عقل نے زمین و آسمان کو فتح تو کرلیا

ہے لیکن اگر عقل کو علم کا عرفان حاصل نہ ہو تو بے مقصد ہے۔ انہوں نے گریز کرتے ہوئے اپنے موقف کو اس طرح اُجاگر کیا ہے۔

علم کا عرفان ہی حاصل نہ ہو تو عقل کیا
ظلمتِ فکر بشر زائل نہ ہو تو عقل کیا
شخصیت انسان کی کامل نہ ہو تو عقل کیا
علم و تمیزِ حق و باطل نہ ہو تو عقل کیا
خیر و شر ہوں سامنے جب خاک اور دُر کی طرح
عقل کی میزاں پہ کیجیے فیصلہ حُرؑ کی طرح

شاعر نے حضرت حُرؑ کے فضائل و محاسن بیان کرتے ہوئے انہیں شجاعت کی تجلی، صداقت کا سراغ، زمین حریت پر فکر شبیری کا باغ، ایوان منزل کا چراغ، آدمیت کے اُجالوں کا شرف، خادم ابن شہنشاہِ نجف، حریت فکر کا بے مثال صدف، کربلا کا منفرد کردار، حریت کا ایزدی معیار، باعثِ بیداری ادوار اور شہیدِ اولین کربلا قرار دیا ہے۔ شاعر نے کرب و بلا کے میدان میں حضرت حُرؑ کی بے مثال شہادت قلمبند کر کے اپنے اسی موقف کو اُجاگر کیا ہے کہ عقل و دانش اگر علم کے سائے میں پروان چڑھے گی تو کامیاب و کامران ہو جائے گی۔ اسی طرح موت مردان حق پرست کا راستہ ہرگز نہیں روک سکتی ہے۔ اس مرثیے کا آخری بند ملاحظہ فرمائیے۔

زندگانی کی رمق تو حُرؑ میں پہلے ہی نہ تھی
بات جب بنتِ علیؑ کی بے ردائی کی سنی
بن گیا سینے میں رُک کر سانس ہچکی موت کی
جسم کے زنداں سے آخر روح نے پرواز کی
موت سے کب نکہتِ اہلِ وفا مسدود ہے
حُرؑ نہیں موجود لیکن حرّیت موجود ہے

اس مرثیے کے بارے میں معروف ناقد ڈاکٹر آغا سہیل کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

''ـــــ سیّد آلِ رضا اور جوش ملیح آبادی جدید اُردو مرثیے کے بانی مبانی ہیں۔ ان دونوں شعراء نے اس وقت کے عصری تقاضوں کو مدِنظر رکھ کر صنفِ مرثیہ کو مادی جدلیت کے تفکر و تعقل سے ہم آہنگ کیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک جدید مرثیہ نگاری اسی ڈگر پر گامزن ہے۔ عرفی ہاشمی سلمہٗ کے والد ماجد حضرت سیّد وحید الحسن ہاشمی اُردو کے رثائی ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور عرفی سلمہٗ ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' کے بموجب ان کے نقشِ قدم پر بھی چل رہے ہیں اور عصری حسیت سے بحمد اللہ نہ صرف واقف و آگاہ ہیں بلکہ مستقبل کے امکانات کے بھی عارف ہیں۔ میں نے ان کے تازہ مراثی میں ''میزانِ خرد'' کا بطورِ خاص مطالعہ کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خارجی اور داخلی دونوں اعتبار سے وہ صنفِ مرثیہ کو سرمایہ دار بنا رہے ہیں۔ ہماری موجودہ اکیسویں صدی اُردو کی جملہ اصناف میں جن شعرا سے بجا طور پر ارتقا کی اُمید رکھتی ہے، عرفی ہاشمی سلمہٗ ان میں نمایاں نظر آرہے ہیں------''

(آغا سہیل ڈاکٹر (رائے) بجھے چراغوں کی روشنی الحسن پبلی کیشنز ۲۰۰۵ باردوم ص۱۲)

(ب) سیاستِ تبسم

''سیاستِ تبسم'' نامی مرثیہ ترپن (۵۳) بندوں پر مشتمل ہے۔ یہ مرثیہ ۲۰۰۱ء میں تخلیق ہو کر ۲۰۰۵ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

سیاستِ تبسم نامی مرثیہ حضرت علی اصغر علیہ السلام کی بے مثال قربانی کے حوالے سے معرضِ تخلیق میں آیا ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں بالغ افکار کے

پھولوں کی مہک اس لیے زخمی ہے کہ گردن ذہن رسا پنجۂ طاغوت میں آ چکی ہے اور جسم کے تابوت میں روح ایک لاش بن چکی ہے۔ ہر ذی ہوش اپنے لبوں پر تالا لگائے خاموش بیٹھا ہے۔ حالات حاضرہ کے ستائے ہوئے افسردہ و غم زدہ افراد بھی ''سب اچھا ہے'' کے منافقانہ نعرے بلند کر رہے ہیں۔ اس طرز عمل کا منفی نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ منافقانہ سیاست، بے راہ روی، بے ضمیری، تنگ نظری، کم ظرفی، ریاکیشی اور علم دشمنی ہمارے رگ و پے میں جاری و ساری ہو گئی۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ اگر ہم آج بھی کربلا سے ربط قائم کر لیں تو دنیا و آخرت میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

کربلا جانتی ہے دور ستم کاری ہے
وحشت و دہشت و تخریب و دلآزاری ہے
درد ہے، زخم ہے، افلاس ہے خونباری ہے
پھر بھی اک قافلہ ہے جس کا سفر جاری ہے
یہ در فکر سجائیں گے کہ تعمیری ہیں
کربلا منتظر ان کی ہے جو شبیری ہیں

شاعر احساس دلاتا ہے کہ جو قومیں اپنے دل میں حب حسینؑ کی شمعیں روشن کر لیتی ہیں ان کے لیے راہوں کی مشکلیں سہل ہو جاتی ہیں۔ شاعر کے نزدیک حسینیؑ جذبہ انسان کے لیے توانائی کا باعث ہے۔ یہ جذبہ پیغام وفا، درس خودداری و ایثار و وفا، نقشۂ جادہ تسلیم و رضا اور آدمی میں چھپا انسان بیدار کرنے کا موجب بنتا ہے۔ بقول شاعر

اسی جذبے سے نمو پاتا ہے ارمانِ جہاد
کبھی دنیا تو کبھی خود سے ہے اعلان جہاد
کوئی دیکھے تو ذرا وسعتِ امکانِ جہاد
باپ کی گود کا بستر بھی ہے میدان جہاد

تیرگی شام کی جب روبہ اثر ہوتی ہے
ایک بچے کے تبسم سے سحر ہوتی ہے

عرفی ہاشمی کے نزدیک حضرت علی اصغر علیہ السلام کا تبسم حیات جاوداں، تحریک انسانیت، محافظ کعبہ، رمز شہادت، پیمان وفا، بقائے ہستی، صبائے گلشن امن اور فضائے قدس کا ترانہ ہے۔ بقول شاعر۔

اس تبسم میں محمدؐ کی فراست بھی ملی
فاتحِ خیبر و خندق کی شجاعت بھی ملی
بانیٔ فلسفۂ امن کی سیرت بھی ملی
دستِ شبیرؑ پہ فردوسِ شہادت بھی ملی
چشم تحقیق اگر ذوق ہنر لائے گی
کربلا ایک تبسم میں نظر آئے گی

عرفی ہاشمی نے اس مرثیے کے آخر میں کرب وبلا کے میدان میں حضرت علی اصغر علیہ السلام کی شہادت کے مختلف رُخ بیان کیے ہیں اور احساس دلایا ہے کہ ان کے تبسم نے کس طرح کربلا کی جنگ کو فتح و کامرانی سے ہم کنار کیا ہے۔ شاعر نے شہادت حضرت علی اصغرؑ کے دردناک مناظر کو بڑے سلیقے سے اُجاگر کیا ہے۔ خاص طور پر اس معصوم بچے کی شہادت کے حوالے سے شاعر نے ماں اور بہن کے جذبات بڑی ہنرمندی سے پیش کیے ہیں۔ اس تمام المناک صورت حال میں بھی شاعر اپنے مقصد اور موضوع سے غافل نہیں ہوتا ہے۔ اس مرثیے کا آخری بند ملاحظہ فرمایئے۔

حال دل ماں کا جو اشکوں کی زباں نے کھولا
خشک ہونٹوں سے تبسم کے اُجالوں نے کہا
نہیں کچھ اس کے سوا جہد وفا کا قصہ
کفر سے جنگ تھی اس جنگ میں حق جیت گیا

اک صدا ہونٹوں سے تا دیدۂ بیدار گئی
ایک بچے کے تبسم سے اجل ہار گئی

اس مرثیے کے حوالے سے معروف دانشور اور نقاد **ڈاکٹر سلیم اختر** کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

"——مرثیہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس میں متعدد اصناف سخن کے ذائقوں کا امتزاج ملتا ہے۔ اسی لیے مرثیہ کہنا آسان نہیں کہ مرثیہ نگار کو مرثیے کی تشکیل کرنے والے فنی محاسن سے وابستہ ہیئت اور اسلوب کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے تاہم دیگر مرثیہ نگاروں کی طرح سید عرفی ہاشمی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مرثیوں میں کسی طرح بھی مرثیے کی ہیئت اور اسلوب کی جمالیات سے وابستہ تقاضوں کو مجروح نہ ہونے دیا اور یہ احساس دلایا کہ

ع راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں

عرفی ہاشمی جیسے نوجوان مرثیہ نگار کی تخلیقی کاوشیں ان کی شاعرانہ ہنرمندیوں کا احساس دلاتی ہیں۔ حضرت علی اصغرؑ کے تیر کھانے کے بعد آخری تبسم کے حوالے سے جب وہ مرثیہ بعنوان "سیاستِ تبسم" رقم کرتے ہیں تو ایک بچے کی المناک شہادت کے حوالے سے بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ انہوں نے اس مرثیے کو آہ و بکا کی سطح سے بلند کر کے عصر حاضر کے لیے ایک آئینہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس مرثیے میں جو فنی پختگی نظر آتی ہے وہ عرفی ہاشمی کے کامیاب مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔ مجھے ان سے اسی طرح کے اور بھی اچھے مرثیوں کی توقع ہے

"——

(ڈاکٹر سلیم اختر سیاستِ تبسم (رائے) بجھے چراغوں کی روشنی الحسن پبلی کیشنز ۲۰۰۵ ص ۴۷)

(ج) محنت اور ادیب

''محنت اور ادیب'' عرفی ہاشمی کا ایک منفرد مرثیہ ہے جو ۲۰۰۲ء میں کہا گیا اور ۲۰۰۵ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ باون بندوں پر مشتمل یہ مرثیہ فکری اور فنی ہر اعتبار سے قابل قدر اور لائق صد تحسین ہے۔

''محنت اور ادیب'' میں شاعر نے اکیسویں صدی کو ہوس کا نقیب قرار دیا ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ اب مفادِ ذات کا سایہ اتنا مہیب ہو گیا ہے کہ پہلے بشر غریب ہوتا تھا لیکن اس صدی میں بشریت غریب ہو گئی ہے۔ شاعر احساس دلاتا ہے کہ انسان کا چراغِ ضمیر بجھ چکا ہے۔ ملکِ ادب کو ثقافت کے نام پر لوٹ لیا گیا ہے اور تہذیب مدرسے کے دریچوں میں کہیں سو گئی ہے۔ ادیبوں اور شاعروں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنا مدِ مقابل بنا لیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ عصر حاضر کا ادب جدید زندگی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ اسی لیے معاشرے میں ادب اور ادیب کی حیثیت کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے۔

عرفی ہاشمی نے اس صورت حال کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے ملاحظہ فرمائیے:

دلچسپ کس قدر ہے تماشائے زندگی
راہِ عمل سے کٹ کے کہاں جائے زندگی
ایسے ادب سے خود کو جو بہلائے زندگی
عبرت کے مدفنوں میں نظر آئے زندگی
کیا زندگی کا ایسے ادب سے نباہ ہو
فٹ پاتھ جس کی آخری آرام گاہ ہو

عرفی ہاشمی کا موقف یہ ہے کہ عصر حاضر کے ادب کو پیام عمل سے مالا مال ہونا چاہیے اور جب تک ادب میں عہد جدید کے مسائل کا حل نہیں ہوگا وہ قارئین کے لیے قابل قبول نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں ان کا یہ بند بھی ملاحظہ فرمائیے:

جب منزل عمل سے ہوا دور یہ ادب
ہر زاویے سے ہو گیا مقہور یہ ادب
بھٹکے ہوئے شعور کا منشور یہ ادب
اجرت عذابِ زیست ہے، مزدور یہ ادب
اجڑا ہوا ہے مصر کے بازار کی طرح
تاریک ہے یزید کے کردار کی طرح

شاعر کا موقف یہ ہے کہ عصر حاضر کے ادب کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اسے انسان کے مسائل و معاملات کا نگہدار ہونا چاہیے۔ اسی طرح شاعروں اور ادیبوں کو بھی چاہیے کہ وہ قول و فعل کے تضادات کو ختم کرنے کی سعی کریں اور دوش فن پر پڑی ہوئی تصنع کی شال اُتار کر پھینک دیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ شہرت اور داد و دہش کا خیال دل سے نکال کر حق و صداقت کی ایسی شمع روشن کریں جو گیسوئے ملک و قوم سنوار دے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ اگر تخلیق کار شعر و ادب کی معراج حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرح محنت و مشقت کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔ شاعر نے محنت و مشقت کی عظمتیں بیان کر کے اہل دانش پر یہ نکتہ باور کرایا ہے کہ کرب و بلا کے میدان میں امام عالی مقام اور ان کے انصار و اقربا نے محنت کے ساتھ جو قربانیاں پیش کی ہیں وہ صفحۂ ہستی پر ہمیشہ جگمگاتی رہیں گی۔ اس مرثیے کا آخری بند ملاحظہ فرمایئے۔

اس حشر میں بھی عظمت کعبہ کا پاسباں
اپنے بدن پہ اوڑھ کے زخموں کی کہکشاں
ہاتھوں میں ہتھکڑی لیے، پیروں میں بیڑیاں
محنت کی شاہراہ پہ دیتا رہا اذاں
سرمایۂ پیامِ اب و جد بچا لیا
محنت سے اپنی، دینِ محمدؐ بچا لیا

عرفی ہاشمی کے اس یگانہ مرثیے کے حوالے سے معروف نقاد' دانشور اور محقق **ڈاکٹر انور سدید** رقم طراز ہیں:

''—— مرثیہ کی تخلیق شہدائے کربلا کی عزاداری سے وابستہ سمجھی جاتی ہے لیکن یہ ان شہیدوں کی عزاداری ہے جنہوں نے باطل کی یزیدی قوتوں کے سامنے حق کا پرچم زندگی کے آخری لمحات تک سربلند رکھا اور ایسی قدروں کی پاسداری کی جو مستقبل کے عالمی انسان کو دائمی راہنمائی فراہم کریں اور ایک مستحکم اخلاقی نظام کی تبلیغ عام کردیں' اہم بات یہ کہ مرثیہ کی بیانیہ شاعری میں مرورِایام میں جو وسعتیں پیدا کی گئیں' ان کا مرکز ومحور تو امامِ کربلا کی شہادت ہی تھی لیکن زمانے کے تقاضے کے مطابق اخلاقی' ادبی اور فنی روایات کے علاوہ سماجی اور تہذیبی اقدار کی پیشکش کو بھی اہمیت دی جانے لگی' چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ مرثیہ کے فنی فروغ میں اعلیٰ ترین خدمات برصغیر ہند میں میر انیس اور مرزا دبیر نے انجام دی تھیں اور آزادی کے بعد پاکستان میں مرثیہ کو جدیدیت کی راہ پر گامزن کرنے اور نئے امکانات منور کرنے میں یہ خدمات سیّد وحیدالحسن ہاشمی نے ادا کیں' چنانچہ اب جو مرثیہ لکھا جارہا ہے' اس نے موضوع کی بنیادی مرکزیت کو قائم رکھتے ہوئے زندگی کی تمام جہات میں قلم آرائی کی ہے۔

عرفی ہاشمی ''دبستانِ وحیدالحسن ہاشمی'' کے ایک ایسے فرد ہیں' جن کی تربیت ہی جدید مرثیے کے گہوارے میں ہوئی ہے۔ میں نے ان کی چند تخلیقات رسالہ ''شام وسحر'' میں پڑھیں تو احساس ہوا کہ وہ حالیہ دور کے زوال پذیر معاشرے کو نہ صرف غائر نظروں سے دیکھ رہے ہیں بلکہ اس معاشرے کی ''یزیدیت'' پر تلخ وترش ردِعمل بھی ظاہر کررہے ہیں'

ان کے تخلیقی عمل کی مثبت جہت یہ ہے کہ اخلاقی اعتبار سے مضبوط معاشرے کی تعمیر کے لیے ان کے سامنے شہید کربلا کی سیرت اور عمل مثالی حیثیت رکھتا ہے لیکن ان کا اساسی موضوع اس عہد کی معاشرتی' اخلاقی' ادبی اور تہذیبی زندگی ہے جو زوال کی زد میں ہے۔ عرفی ہاشمی کا مختصر مرثیہ ''محنت اور ادیب'' اکیسویں صدی کے آغاز کے برسوں میں اس وقت لکھا گیا جب اردو معاشرے کا ادیب قعرِ مذلت میں ڈوب چکا تھا' خودداریوں کا کھیل ہوس کا نقیب بن چکا تھا' مفاداتِ ذات کی چوہا دوڑ میں ادیب اپنا آفاقی مقام کھو چکا تھا اور ''سگِ دنیا'' بن کر ادب سے بے بہرہ سرکار دولت مدار کی چوکھٹ پر جبیں سائی کر رہا تھا۔ عرفی ہاشمی کا تاثر یہ ہے کہ پہلے بشر غریب تھا لیکن وہ غیور تھا' خوددار تھا اور اپنی خودی کا محافظ و پاسبان تھا لیکن اب بشریت غریب ہو چکی ہے اور احساسِ زیاں تک جاتا رہا ہے حتیٰ کہ آج کا مشہور اور مقبول ادیب اپنی شہرت کے تحفظ کے لیے ایسے دروازے کھٹکھٹا رہا ہے جہاں انصاف کے نام پر بے انصافی کا سکہ چل رہا ہے۔ عرفی ہاشمی کا یہ مرثیہ مختصر ہے لیکن یہ وسیع المعانی اور وسیع الجہات ہے۔ ادب کے وسیع تناظر میں مرثیے کی ''ٹیپ'' ایسی مجسم حقیقت ہے جس کا درد محسوس کرتے کرتے نرگس بے نور ہو جاتی ہے اور ٹیپ ضرب المثل بن جاتی ہے۔ ان کا روئے سخن کسی مخصوص شخصیت کی طرف نہیں بلکہ سب کی طرف ہے

اک داغ ہے وہ دامنِ افکار کے لیے
تخلیق جس ادب کی ہو بازار کے لیے

....

کیا اس ادب کا سلسلہ معیار سے ملے
کی سند جسے اخبار سے ملے

عرفی ہاشمی کا یہ مرثیہ معنوی طور پر ایک ''ادب آشوب'' ہے لیکن وہ جب
ذکرِ امام کربلا کی طرف آتے ہیں تو ان کی رجائیت ہویدا ہوتی چلی جاتی
ہے اور ان کا صحت مند مقصد قاری کے ذہنی اُفق پر محنت کے چراغ
روشن کر دیتا ہے۔ میں اس مرثیے کی اشاعت کا منتظر ہوں اور یہ دیکھنے
کا آرزومند ہوں کہ ہمارا بیمار معاشرہ اور بدنصیب ادیب اس مرثیے
سے عملی طور پر کس طرح استفادہ کرتا ہے۔''

(انور سدید،ڈاکٹر عرض سدید (رائے) مملوکہ راقم الحروف الرقومہ ۳۰ جنوری ۲۰۰۵ء، لاہور)

(۶) اکیسویں صدی اور کربلا

''اکیسویں صدی اور کربلا'' نامی مرثیہ سینتالیس (۴۷) بندوں پر مشتمل ہے۔
یہ مرثیہ ۲۰۰۳ء میں تخلیق ہو کر ۲۰۰۵ء میں طبع ہوا۔

''اکیسویں صدی اور کربلا'' میں عرفی ہاشمی نے محورِ تکنیک سے ہٹ کر یقین کی
بات کرنے کا عزم کیا ہے۔ ان کا واضح موقف یہ ہے کہ اب ہمیں گزری ہوئی بیس صدیوں
کے بجائے اکیسویں صدی کی بات کرنا چاہیے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ اکیسویں صدی
بیس صدیوں کا خون پی کر جوان ہوئی ہے اور اسی باعث یہ صدی کوفی و شامی کے وعدوں
کی طرح بے اثر ہے اور اس کے کاندھوں پر کئی اقدار کا جنازہ دھرا ہے۔ اس سلسلے میں
ایک فکر انگیز بند آپ بھی ملاحظہ فرمایئے:

اس کی پیشانی کا جھومر مادے کا ارتقا
اس کی آنکھوں کی کشش ایجادِ بیم کی ضیا
اس کے رخساروں کی تابش تابکاری جابجا
اس کے دل کی دھڑکنیں سرمایہ داری کی بقا
حُسن اسکا عارضی ہے دارِ فانی کی طرح
یہ صدی بھی ہے زلیخا کی جوانی کی طرح

شاعر احساس دلاتا ہے کہ یہ صدی محض تجربوں کی برتری کا دور ہے اور اب یہ قوموں کا نہیں بلکہ ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صدی مقتل کرب وبلا سے کم نہیں ہے۔ اس صدی میں نسل انسانی روبہ زوال ہوگئی ہے۔ کئی ممالک زوال آمادہ ہو جائیں گے اور سینکڑوں قدآور شجر زمیں بوس ہو جائیں گے۔ اس صدی کو ایک اور مسئلے سے بھی دوچار ہونا ہوگا۔ ملاحظہ فرمایئے:

یہ صدی ازخود مسائل کا بڑا انبار ہے
روٹی، کپڑے اور مکاں کا ہر طرف اصرار ہے
نفسیاتی طور پر اتنا بشر بیمار ہے
جسم کے نیزے پہ سر ہے، سانس اک تلوار ہے
غربت و بیماری و ناخواندگی کا غم بھی ہے
ان میں شامل بڑھتی آبادی کا ایٹم بم بھی ہے

عرفی ہاشمی کے نزدیک اس صدی نے جہاں بہت سے ضرر رساں پہلوؤں سے روشناس کرایا ہے وہاں اس نے دہر کو آسائشوں کی کہکشاں سے بھی بھر دیا ہے۔ تاہم ایک بات طے ہے کہ اس صدی نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی دولت عطا کرنے کے باوجود بھری دنیا میں انسان کو تنہا کر دیا ہے۔ شاعر کو اس بات کا بے حد قلق ہے کہ وہ اس صدی میں نارسائی کا زہر پی رہا ہے اور اس بھری دنیا میں بھی خود کو تلاش کر رہا ہے۔ اس سے بھی زیادہ الم انگیز بات یہ ہے کہ۔

جب سے ان تنہائیوں کا زہر پینا آ گیا
بے حسی سے بزدلی کا زخم سینا آ گیا
ذہن میں بدبختی، سوچوں میں کینہ آ گیا
اس صدی میں مجھ کو جینے کا قرینہ آ گیا

اعتبارِ ذات کھو کر مصلحت کے گھر میں ہوں
کلمہ گو ہوں اور یزید وقت کے لشکر میں ہوں

شاعر احساس دلاتا ہے کہ یہ صدی بے ضمیر آدمی کی شمر سازی میں مدد کرتی ہے۔ اس صورتِ حال میں کربلا طلوع ہوتی ہے اور اپنا مثبت کردار ادا کرتی ہے۔ شاعر کے نزدیک کربلا ایک حادثاتی واقعہ نہیں ہے اور نہ یہ ذاتی مفادات کی معرکہ آرائی کا نام ہے۔ شاعر کے نزدیک کربلا کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

منفعل بے روح پیکر ہی نہیں ہے کربلا
جنگ میں سامان لشکر ہی نہیں ہے کربلا
خاک و خوں ریزی کا منظر ہی نہیں ہے کربلا
اشتہار صبح محشر ہی نہیں ہے کربلا
موت سینے سے لگا کر زندگی کرنے کا نام
کربلا ہے دل جلا کر روشنی کرنے کا نام

شاعر احساس دلاتا ہے کہ کرب و بلا کے ریگزار میں امام عالی مقام نے خود احتسابی کے لیے شب عاشور میں چراغوں کو گل کر کے ایک نئی تاریخ رقم کی تھی۔ اصحاب حسینؑ نے اپنے طرز عمل سے اہل محبت پر یہ راز آشکار کر دیا ہے کہ باطل کے سامنے سینہ سپر رہنا ہی حق شناسی ہے۔ شاعر نے کمال مہارت سے شب عاشور کے فضائل اُجاگر کیے ہیں اور آخری بندوں میں ایک المیاتی فضا قائم کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ اس مرثیے کے آخری بند کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ شاعر نے کس طرح حزنیہ کیفیت پیش کی ہے۔

شدت احساس غم سے نیم جاں ہیں بیبیاں
اپنے پیاروں کے لیے گریہ کناں ہیں بیبیاں

ضبط کی حد رہ گئی پیچھے جہاں ہیں بیبیاں
دیکھ لیں عباسؑ و اکبرؑ اب کہاں ہیں بیبیاں

راہِ احساسات میں اک درد کا موسم بھی ہے
شام کے بازار میں بے پردگی کا غم بھی ہے

اس مرثیے کے حوالے سے معروف شاعر اور دانشور **شہزاد احمد** کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

"—— اس کو بھی ایک المیہ ہی سمجھئے کہ اقبال نے اپنی زندگی کے آخری دور میں "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" لکھی۔ وہ بھی کئی لحاظ سے مرثیے ہی کی ایک شکل کہی جا سکتی ہے۔ اگرچہ اسے مثنوی کے رنگ میں لکھا گیا ہے۔ عرفی ہاشمی نے اس سرے کو وہاں سے پکڑا ہے جہاں اقبال نے اسے چھوڑا تھا۔ فردا کے بارے میں پیش گوئی کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور کسی غیر معمولی وژن کے بغیر ایسا کرنا ممکن بھی نہیں ہوتا۔ عرفی ہاشمی نے لمحۂ حال کے حوالے سے ماضی و مستقبل دونوں کو ایک ہی لمحے میں گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے اور اس کے نتیجے میں بہت سے متناقضات (Paradoxes) اُبھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ ہم عصر صورتِ حال کی طرح اس مرثیے کو بھی بہت سے زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ فلکیات والے کہتے ہیں کہ آسمان کو آپ کہیں سے بھی دیکھیں وہ ایک جیسا نظر آتا ہے۔ میرے خیال میں اس مقولے کا اطلاق زیرِ نظر مرثیے پر بھی ہو سکتا ہے۔ آپ اسے کسی بھی زاویے سے دیکھنے کی کوشش کریں اس کی صورت گری میں کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوتا۔ ——"

(شہزاد احمد ایکسویں صدی اور کربلا بجھے چراغوں کی روشنی الحسن پبلی کیشنز ۲۰۰۵ء ص ۱۸۳)

سید عرفی ہاشمی کے مرثیوں کے عمیق مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ صنف مرثیہ سے طبعی رغبت رکھتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اپنے جدید اور مختصر مرثیوں کے ذریعہ اس صنف کی آبیاری کی بلکہ اس کے تحفظ اور فروغ کے لیے جدید تر نظریات بھی وضع کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ عرفی ہاشمی کی پیش کردہ تجاویز سے استفادہ کر کے ہم اس کلاسیکی صنف کو جدید رویوں کا علمبردار بنا سکتے ہیں۔

عرفی ہاشمی کے مرثیوں کے مطالعہ کے بعد ان کی مرثیہ نگاری کی دو خصوصیات ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ا) جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے نظریات کا اظہار

ب) جدت اور کلاسیکیت کا حسین شعری امتزاج

اب ذیل میں ان دونوں خصوصیات کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں:

عرفی ہاشمی سائنس، ٹیکنالوجی اور بزنس کے آدمی ہیں اور وہ شعر و ادب اور خصوصاً مرثیے کو بھی اسی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ سب سے پہلے ان کی اپنی رائے ملاحظہ فرمالیجئے:

"—— میں بنیادی طور پر بزنس اور ٹیکنالوجی کی فیلڈ سے متعلق ہوں۔ جدت اور Innovation میرا سرمایہ اور شناخت ہونے کے ساتھ ساتھ میری مجبوری بھی ہیں۔ اپنے احساسات اور خیالات کے اظہار کا حق مجھے بہترین ذریعۂ اظہار کی تلاش پر مجبور کرتا ہے۔ میرا یہ حق اظہار کسی صنف سخن کا مرہون منت نہیں بلکہ ہر صنف سخن اس حق اظہار کی بدولت ہے، یہی استحقاق میری مرثیہ گوئی کا جواز ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کیلئے مجھے مرثیے سے زیادہ کشادہ کوئی اور صنف محسوس نہیں ہوئی۔ سو میں مرثیہ لکھتا ہوں، مرثیے میں بولتا ہوں، اپنے اور معاشرے کے تشخص کو مرثیے کی میزان پر تولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس شعوری تجزیے کے بعد اپنے احساسات و خیالات کو مصرعوں کی شکل میں صفحۂ قرطاس کے حوالے کر

دیتا ہوں۔اس سے آگے کا کام میرا نہیں ہے ———"

(عرفی ہاشمی بجھے چراغوں کی روشنی لاہور: الحسن پبلی کیشنز بار دوم ۲۰۰۵)

درج بالا معروضے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں کہ عرفی ہاشمی نے اپنے مرثیوں میں جدید سائنسی افکار و نظریات کو جگہ دی ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کسی بھی مقام پر شعریت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ان کا اسلوب شعر خیال کا تابع دکھائی دیتا ہے۔آپ ان کے مرثیوں کے درج ذیل بندوں کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھئے کہ ان میں جدید تر سائنسی افکار موجزن ہیں یا نہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ تمام بندوں میں شعریت بھی موجود ہے۔

منزلِ انجام پر ہے میں صدیوں کا سفر
ہیں صدیاں اپنے دامن میں لئے ہیں وہ گہر
جن سے روشن ہے تمدن کی شعوری رہگذر
زندگی جن کی بدولت آج ہے معراج پر
زندگی اس راہ پر رفتار اپنی دیکھ کر
ہنس رہی ہے چاند تاروں کی بلندی دیکھ کر

....

عقلِ انسانی کا یہ مربوط دورِ ارتقا
تجربوں کی یہ فلک بوسی یہ تسخیرِ خلا
یہ لگن، یہ دھن، یہ کاوش، یہ طلب، یہ تجربہ
تجربوں کی حد میں پروازِ خرد کا سلسلہ
کیا خبر کل تجربہ کوئی معاون ہو سکے
دھوپ اپنے پاؤں پر دنیا میں ساکن ہو سکے

عقلِ انساں عازمِ تسخیرِ کل افلاک ہے
ہر عروجِ کن فکاں پر ثبت اس کی دھاک ہے
ہر بلندی اس کی نظروں میں قدم کی خاک ہے
برق سے بھی تیز اس کا توسنِ بے باک ہے
عقلِ انساں فتح کا پرچم قمر پر گاڑ کر
آسماں کو تک رہی ہے گردِ دامن جھاڑ کر

....

زندگی کی اس بلندی کو پرکھیے عقل سے
عقل سے روشن ہیں انساں کی بقا کے راستے
راستوں کے پیچ و خم میں جستجو کے قافلے
مستقل طے کر رہے ہیں ارتقائی مرحلے
مرحلے جن کو نظر انداز کرنا موت ہے
اس سفر میں ایک لمحہ بھی ٹھہرنا موت ہے

....

بحرِ ایجادات کی بڑھتی ہوئی طغیانیاں
طبعِ انسانی کی ندرت آفریں جولانیاں
اپنے ذہنوں میں سجائے بے شمار آسانیاں
خم کیے ہیں مشکلاتِ دہر کی پیشانیاں
کیا خبر پہنچے یہاں تک عالمِ ایجاد بھی
موم ہو جائے نظر کی ضرب سے فولاد بھی

....

موجزن عقلِ بشر میں آرزوئے ارتقا
آرزوئے ارتقا میں محنتوں کی ابتدا
محنتوں کے زیرِ سایہ تجربوں کا سلسلہ
تجربوں سے ضوفشاں دریافتوں کا راستہ
کیا خبر منظر ہو کل یہ چشمِ حیرت کیلئے
چل کے آئے خود کنواں پیاسے کی خدمت کیلئے

....

عرفی ہاشمی ''دبستان وحید الحسن ہاشمی'' سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا مرثیے کی کلاسیکی روایت سے ان کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ وہ دراصل اس حقیقت سے کما حقہٗ آگاہ ہیں کہ جدّت ہمیشہ روایت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے جدید مرثیوں میں بھی کلاسیکل اساتذہ کے مصرعوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ وہ بات کو سلیقے سے پیش کرنے کے عادی ہیں یہی سبب ہے کہ وہ جدید شعر میں بھی کوئی نہ کوئی ایسا لفظ ضرور رکھ دیتے ہیں جو قدیم کلاسیکی روایت سے ان کا ناتہ جوڑ دیتا ہے۔ عرفی ہاشمی کی یہی خصوصیت انہیں اپنے ہم عصر مرثیہ نگاروں سے ممتاز کرنے کا سبب ہے۔ آپ مختلف مرثیوں کے منتخب درج ذیل بندوں کا مطالعہ فرمالیجئے اور دیکھیے کہ انہوں نے کتنی مہارت اور سلیقے سے جدّت وقدامت کا حسین امتزاج پیش کردیا ہے۔

سینۂ مہتاب پر نقشِ قدم انسان کا
ہو کے سرشارِ تفاخرُ دے رہا ہے یہ صدا
اک قمر کافی نہیں ہے میری محنت کا صلہ
جتنے اجرام فلک ہیں اب یہ سن لیں برملا
عین ممکن ہے خلا ہو فتح شہروں کی طرح
سارے سیارے گنوں میں گھر کے کمروں کی طرح

حالتِ غیظ و غضب دیکھی جو موجِ تند کی
عقلِ انساں لے کے اوزارِ ہنر آگے بڑھی
جب غرورِ بحر پہ تدبیر کی ضربت لگی
شرمساری کی شفق سرخ آنسوؤں میں ڈھل گئی
یہ حبابوں کے گہر جو موج کی چلمن پہ ہیں
اشک کے قطرے لباسِ بحر کے دامن پہ ہیں

....

عقل کا اصرار تھا شبیرؑ وہ انسان ہے
جس کی قندیلِ سخن کی روشنی قرآن ہے
جس کے منشورِ عمل کا برملا اعلان ہے
کربلا اسلام کے دستور کا عنوان ہے
قوتِ شبیرؑ کی منہ بولتی تصویر ہے
کربلا مظلوم کی سب سے بڑی جاگیر ہے

....

حرملہ تو نے بڑے جوش سے پھینکا تھا جو تیر
پہلا مقتول تھا اس تیر کا خود تیرا ضمیر
چاند بن جائے جہاں صبح کی عصمت کا سفیر
چاندنی کیا ہو وہاں شام کی بانہوں میں اسیر
وہ عمل حرملہ تو جس کو ہنسی سمجھا ہے
بے بسی پہ تری اِک قہقہہ تاریخ کا ہے

....

اکیسویں صدی کا تعارف عجیب ہے
خودداریوں کا کھیل ہوس کا نقیب ہے
انا مفاد ذات کا سایہ مہیب ہے
پہلے بشر تھا اب بشریت غریب ہے
یہ خارِ غم بھی فکر کی پھلواریوں میں ہے
ورثہ ہمارا شیشے کی الماریوں میں ہے

....

شورشِ تخریب بھی ہے منظرِ تعمیر بھی
انتشارِ فکر بھی ہے حرمتِ تدبیر بھی
ظلم کی ضربِ گراں بھی، صبر کی تاثیر بھی
یہ یزیدی ظلم بھی ہے عصمتِ شبیرؑ بھی
وسعتِ احساس میں شہرِ تصور کی طرح
یہ صدی بھی ہے فضائے خیمۂ حرؑ کی طرح

....

اس قدر معکوس ہے اس کے ادب کا ارتقا
وہ ادیبِ وقت ہے جسکو نوازے میڈیا
کیسا فن، کیسا ہنر، معیار سے کیا رابطہ
لوگ اب کہنے لگے شعر و ادب کو سانحہ
عنقریب اس سانحے پر تبصرہ آ جائے گا
شاعری پر شاعروں کا مرثیہ آ جائے گا

....

کیا فقط اک حادثاتی واقعہ ہے کربلا
کیا مفادِ ذات کا اک معرکہ ہے کربلا
کیا کسی املاک کا جغرافیہ ہے کربلا
کیا مجالس میں خطیبوں کی ادا ہے کربلا
روحِ دیں، فرشِ عزا پر ہی نہ سو جائے کہیں
کربلا جلسے جلوسوں میں نہ کھو جائے کہیں

....

کتنے مہ پارے تھے جو راہِ سفر میں کھو گئے
گر گئے اونٹوں سے اور پیوندِ صحرا ہو گئے
شام تک کی رہگزر اپنے لہو سے دھو گئے
گودیوں میں سونے والے راستوں میں سو گئے
دفن کچھ دل میں ہوئے کچھ آنسوؤں میں بہہ گئے
ماؤں کے سب خواب صحرا میں بکھر کر رہ گئے

....

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ عصر حاضر میں صنف مرثیہ کے کوچے میں وہی قدم رکھ سکتا ہے جسے جملہ اصنافِ سخن پر عبور حاصل ہو۔ سید عرفی ہاشمی نوجوان شعرا کی اس صف میں شمار کیے جا سکتے ہیں جنھوں نے بہت کم عرصہ میں چار جدید مرثیہ تخلیق کر کے صاحبانِ فہم و ذکا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ان کے مرثیوں کے مطالعہ کے بعد بلا خوف و تردد کہا جا سکتا ہے کہ اب پاکستان میں اُردو مرثیے کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔

◆◆◆

◆◆◆

انسانی جذبات کا عکاس شاعر۔ ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی

◆◆

شاعری میں جذبے کی اہمیت مسلم ہے۔ لونجائنس سے لے کر الطاف حسین حالی تک تمام اہم ناقدین نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ارفع جذبات کی بدولت شاعری میں وقعت اور جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب کوئی معتبر شاعر اپنے ذاتی جذبے کو آفاقی قدروں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے شعری افکار عوام الناس میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور خواص ان میں گہرائی اور گیرائی بھی تلاش کرتے ہیں۔ میر تقی میر کے اشعار اگرچہ خواص میں پسندیدہ تھے لیکن وہ اپنی شاعری میں گفتگو عوام ہی سے کرتے تھے۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

دانش مند شاعر کی حسرت ہوتی ہے کہ اس کے اشعار بیک وقت عوام و خواص میں مقبول ہوں۔ اس کے لیے وہ ان بنیادی جذبات و احساسات کا سہارا لیتا ہے جو سب کے لیے یکساں مفید ہوں اور بیک وقت عوام و خواص کی تسکین کا باعث بن سکیں۔ اس صورت حال میں دور اندیش شاعر اسے ارفع جذبات کے ساتھ ساتھ سادہ زبان کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے۔ غالباً اسی لیے حالی نے اچھی شاعری کے لیے "سادگی" اور عظیم شاعر کے لیے 'تفحص الفاظ' کی شرط عاید کی تھی۔ **ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی** کی شاعری کا منظر نامہ

مرتب کرتے ہوئے یہی دونوں رویے اساسی شکل اختیار کر جاتے ہیں کہ وہ اپنے ارفع جذبات وخیالات کو سادہ زبان میں پیش کر کے صاحبانِ فہم وذکا سے داد سمیٹ لیتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ عصر حاضر کی بے ہنگم شاعری میں سادگی اور سلاست کو فروغ دینا ایک دشوار کام ہے مگر ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی بڑے ذوق وشوق سے چراغ شاعری کو بچانے کے لیے ہوا کے رُخ کو تبدیل کرنے میں مصروف ہیں۔

چراغوں کو بچانے کے لیے میں
ہوا کا رُخ بدلنا چاہتا ہوں

اردو شاعری میں سادہ شعر کہنے کی طویل روایت موجود ہے۔ میر اور مومن سے لے کر عبدالحمید عدم تک سادہ گو شعرا کی ایک فوج ظفر موج موجود ہے تاہم اعتبار صرف ان شعرا کے مقدر میں آیا جنھوں نے اپنی شاعری میں سادگی وسلاست اور معنویت وگہرائی کو آمیخت کیا۔ مومن اور میر کے بے شمار اشعار سہلِ ممتنع کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اسی طرح عہد جدید میں عدم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے شاعری کو نہ تو فلسفیانہ موشگافیوں کے لیے وقف کیا نہ عالمگیر مسائل پیش کرنے کی سعی کی۔ انہوں نے عوام الناس کے جذبات کو اپنی شاعری کے قالب میں ڈھال کر عوام کے سپرد کر دیا۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے زندگی کو جبرِ مسلسل یا طوفان الم قرار دینے کے بجائے اپنی سہیلی قرار دیا ہے۔

چار دن میرے ساتھ کھیلی ہے
زندگی بھی مری سہیلی ہے

ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی بھی شاعری میں اسی فکری قبیلے کے فرد فرید ہیں۔ انہوں نے میر کی طرح سادہ گوئی، مومن کی طرح معاملہ بندی اور عدم کی طرح صاف بیانی کو اپنی شاعری کی اساس بنایا۔ دشت شاعری کو گلستان بنانے والے ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ عصرِ حاضر میں شاعری محض جی کا زیاں ہے مگر وہ آج بھی صحرائے زندگی میں

اپنے افکار کی خوشبو بکھیرنے میں مگن ہیں۔

مجھے بھی مل ہی جائیں گے سویرے
اگر میرا مقدر بیچ میں ہے

ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی کی شاعری میں حسن وعشق کے مختلف مظاہر جلوہ گر ہیں۔ وہ حسن پرست بھی ہیں اور حسن شناس بھی۔ انہیں خبر ہے کہ عاشق صادق کی سلطنتِ دل پر محبوب حکمراں ہوتا ہے اور اس کے فیضِ کرم سے عاشق کا پورا وجود بقعۂ نور بن جاتا ہے۔ محبوب کی ادائیں اور عشوہ طرازیاں اس اقلیمِ دل کو ہمدوشِ ثریا کر دیتی ہیں۔ دانش مندوں میں یہ سوال آج بھی گردش کر رہا ہے کہ عشق داخلی تجربہ ہے یا معروضی رویہ؟؟ ندیم الحسن گیلانی ان مسائل میں اُلجھنے کے بجائے اقبال کی طرح عشق کو ایک حرکی قوت سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اس نادیدہ قوت کی بدولت عاشق اس کارزارِ حیات میں کچھ کر گزرنے کا اہل ہو جاتا ہے۔ گویا یہ قوت بے عملوں کو عمل کی دنیا میں لے آتی ہے۔ ندیم الحسن گیلانی کا واضح مؤقف یہ ہے کہ جو شخص محبوب سے بے غرضانہ تمسک قائم کر لیتا ہے اس کی دنیا سرخرو ہو جاتی ہے۔ محبوب سے والہانہ لگاؤ کے باعث عاشق کی بے نور آنکھوں میں ضیا پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی خشک زندگی میں پھول کھل اٹھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ندیم الحسن نے اپنی شاعری میں سادگی اور سلاست سے حسن وعشق کے جتنے ذائقے اُجاگر کر دیے ہیں اس کی جتنی بھی مدح سرائی کی جائے کم ہے۔ آپ ندیم گیلانی کے حسن وعشق سے معمور چند اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ انہوں نے حسن وعشق کے کتنے رنگ اور زاویے ہمارے سامنے اُجاگر کر دیے ہیں۔

محبت امتحانوں کا تسلسل ہے اسے کہنا
جو دل میں ہے بچھڑ جانے کا غم اچھا نہیں ہوتا

....

وہ حسن روح پرور بیچ میں ہے
مرے پہلو کے اندر بیچ میں ہے

محبت کا ترانہ جب بھی چھیڑا
اُٹھا کر کوئی دل کا ساز آئی

....

یہ حقیقت ہے حُسن کا خورشید
زُلف کے سائباں سے نکلا ہے

....

تو کہ کردار ہے محبت کا
تو زمانے کی داستاں سے نکل

....

ہر ایک کی نظر میں بہاروں کا رنگ تھا
لائے تھے جتنے لوگ تری انجمن سے پھول

....

کیا بتاؤں کہ رات بھر دل میں
کیسے خواب و خیال پھرتے ہیں

....

عشق یوں کامیاب ہو نہ سکا
حسن کا راستہ عجیب سا تھا

....

بچھڑ کے ہم تری یادیں سنبھال رکھیں گے
جدا ہوئے بھی تو تیرا خیال رکھیں گے

ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی کی شاعری میں ہمارے سماجی رویوں کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ وہ ملک میں بڑھتی ہوئی ناانصافی، بے رحمی، دہشت گردی، عدم مساوات اور اخلاقی قدروں کی پامالی پر انتہائی دل گرفتہ ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ بعض نادیدہ قوتیں ہمارے معاشرے کے صبر و سکون کو تباہ و برباد کرنے کا مصمم ارادہ کر چکی ہیں لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم

اپنے اندر وطن سے والہانہ محبت کے جذبے کو بیدار کریں اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کی تزئین و آرائش کے لیے اپنے جملہ ذرائع بروئے کار لائیں۔ ڈاکٹر ندیم گیلانی احساس دلاتے ہیں کہ ہمارے عہد کے رہبر و رہنما بھی خود غرضانہ مصلحتوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ شخصی مفادات کو مطمح نظر بنانے والے یہ رہنما قوم کی سمت نمائی کا فریضہ ادا کرنے کے اہل ہی نہیں ہیں۔ یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ اب تمام لوگوں نے قومی مفادات کو پس پشت ڈال کر شخصی منفعت کو اہمیت دینا شروع کر دی ہے۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پورا معاشرہ تذبذب کا شکار ہے اور بقول ڈاکٹر گیلانی ہم لوگ کرب و بلا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس معاشرتی کرب کو دیکھ کر ڈاکٹر گیلانی کا لب و لہجہ طنزیہ ضرور ہو جاتا ہے لیکن مایوسی ان کے قریب نہیں پھٹکتی۔ وہ اپنے دل میں رجائیت کا چراغ روشن رکھتے ہیں۔ انہیں یقین کامل ہے کہ آج نہیں تو کل اس سوکھے شجر پر گلاب ضرور مہکیں گے۔

پھول کوئی نظر نہیں آتا
ہم مگر ڈال ڈال پھرتے ہیں

آپ ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ انہوں نے کس طرح معاشرے کی صورتِ حال کی تصویر کشی کی ہے۔

وہ جو ہمدرد ہیں پرندوں کے
لے کے کاندھوں پہ جال پھرتے ہیں

....

منزل کے پاس آ کے بھی منزل نہیں ملی
یہ کیسا کرب راہ نما دے گیا مجھے

....

آری یہ ڈالیوں پہ چلا کر گیا ہے کون
مغموم ہو رہے ہیں بچھڑ کر چمن سے پھول

شہر کا شہر ہی مایوس ہوا ہے جیسے
گام در گام یہاں کرب و بلا رکھا ہے

....

اس باپ سے رہتے ہیں خفا پھول سے بچے
بازار سے لا کر جو کھلونے نہیں دیتا

....

ہر شگوفہ سلگنے والا ہے
کوئی کہتا ہے گلستاں سے نکل

....

دھوپ میں زندگی گزار آئے
سر پہ سایہ نہ عمر بھر آیا

....

ہر اک جانب اندھیرے ناچتے ہیں
چلیں کس راہ پہ کہتا بھی ہے

....

کسی کا حکم تھا یا بھوک کا دکھ
پرندہ جس نے زیرِ دام بھیجا

....

درد و غم کے جہاں سے نکلا ہے
چاند جو آسماں سے نکلا ہے

....

بس یہ ہوا کہ ہم نے دکھایا تھا آئینہ
کم ظرف جتنے لوگ تھے تاؤ میں آ گئے

....

ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی کی شاعری میں سوچ اور فکر کی گہرائی اور گیرائی بھی ملتی ہے۔ وہ نہ تو اقبال کی طرح کوئی منضبط فلسفیانہ نظام مرتب کرنا چاہتے ہیں اور نہ غالب کی طرح فلسفیانہ موشگافیاں کرنے کے متمنی ہیں وہ تو محض زندگی کو ایک کیئر فری (Carefree) انسان کی طرح دیکھنے اور دکھانے کے طلب گار ہیں۔ اگر آپ ندیم گیلانی کی شاعری کا عمیق نگاہی سے مطالعہ کیجیے تو وہ سادہ لفظوں میں غور و فکر کی ایک نئی دنیا سے اپنے قارئین کو روشناس کرا دیتے ہیں۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ ان میں کیسے کیسے جہانِ معنی پوشیدہ ہیں۔

دل اک غم کا بوجھ اٹھائے
ان کے در تک ساتھ گیا ہے

....

رک گئے پاؤں، جھک گئی آنکھیں
سوچتا ہوں، یہ کس کا در آیا

....

اگر بھیجا ہے اس نے میری جانب
سفر، اے گردشِ ایام بھیجا

....

روشنی کی لکیر چھوڑ گیا
غم کا جگنو جہاں سے نکلا ہے

....

وہ ہمیں گزرے زمانوں کا پتہ دیتا ہے
طاق پر ہم نے سجا کر جو دیا رکھا ہے

....

اس کی آنکھوں نے اک دریچے سے
جو دیا آسرا عجیب سا تھا

ہوا انجام کیا کہانی کا
اس کو سوچے تو ایک عمر ہوئی

....

بوجھ یہ سات آسمانوں کا
کوئی سر پر اُٹھا نہیں سکتا

....

ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی کا اسلوب شعر رواں اور متین ہے۔ وہ چھوٹی بحروں میں شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ عدمؔ کی طرح وہ اس راز سے آگاہ ہو گئے ہیں کہ بڑی بات کو کم سے کم لفظوں میں ادا کرنا ہی شاعری ہے۔ ان کی بیشتر غزلیں چھوٹی بحور پر مشتمل ہیں۔ وہ الفاظ کے چناؤ میں محتاط ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں میں ایک خاص طرح کی غنائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو قارئین کے دلوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔ آپ کو ندیم گیلانی کی غزلوں میں جہاں ایک طرف اعلیٰ اخلاقی صداقتیں ملیں گی وہاں دوسری جانب اسلوبیاتی رنگا رنگیاں بھی ملیں گی۔ آپ ان کی مختصر بحروں کے چنیدہ مطالعے ملاحظہ فرمایئے اور ان سے لطف اٹھایئے۔

دشت میں جو غزال پھرتے ہیں
کتنے افسردہ حال پھرتے ہیں

....

پھول اُمید کے کھلے ہوں گے
ہم جہاں آپ سے ملیں ہوں گے

....

نام تیرا بھلا نہیں سکتا
کھول کر دل دکھا نہیں سکتا

....

ان سے بچھڑے تو ایک عمر ہوئی
نیند آئے تو ایک عمر ہوئی

....

شہر میں جب کوئی بھنور آیا
کوئی اپنا نظر نہیں آیا

....

یہ زمیں چھوڑ آسماں سے نکل
جیسے ممکن ہو اس جہاں سے نکل

....

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اُردو زبان میں جذبے کی بدولت پُرعظمت اور پُر تجمل شاعری وجود میں آئی ہے۔ یہ امر انتہائی امتنان کا باعث ہے کہ ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی نے اپنی شاعری میں انسان کے السیاتی اور طربیاتی جذبوں کو احسن طریقے سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ڈاکٹر گیلانی کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے سادہ روی اور سلاست کے ساتھ ان جذبوں کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر گیلانی کے ذاتی جذبے اور تجربے آفاقی سطح کو چھوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ڈاکٹر گیلانی نے میر، مومن اور عدم کی تشکیل کردہ سادہ روی کی روایت کو استحکام عطا کیا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی کی شاعری میں کلاسیکی شعرا کی روایت کی جھلکیاں بھی ہویدا ہیں اور عصری حسیت بھی موجزن ہے۔ جب تک اردو شاعری میں سہل ممتنع کی روایت موجود ہے، ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی کا نام روشن اور تابناک رہے گا۔

اب کہ حالات سے شکوہ نہ شکایت ہم کو
سوچ رکھا ہے جو قسمت میں وہ ملتا کب ہے

◆◆◆

◆◆◆

ڈاکٹر ابوالحسن نقوی کے مرثیوں میں عصری حسیت

◆◆

دانش مند کہتے ہیں کہ شعروادب میں وہ اصناف ہمیشہ زندہ وتابندہ رہتی ہیں جو معاشرتی مقتضیات کا دھیان رکھیں۔ معاشرے کے بدلتے ہوئے رجحانات ومیلانات کو اپنے مزاج کا حصہ بنانے والی اصناف ہر عہد میں تروتازہ رہتی ہیں اور شعروادب پر اپنے مثبت اثرات مرتسم کرتی رہتی ہیں۔ اب شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ معاشرتی رویوں کو اُجاگر کرنے والی صنف کو محض تاریخ نہ بننے دے بلکہ اس کو ہر عہد کے جلال وجمال کا عکاس بنا دے۔ مرثیہ کی صنف کو بھی یہ اختصاص حاصل ہے کہ اس نے ہر عہد کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ہئیتی اور معنوی ہر دو اعتبار سے تبدیل کیا، اپنے عہد کے جملہ تقاضوں کو اپنے اندر سمونے کی بلیغ سعی کی اور ایسی گراں قدر اخلاقی وسماجی اقدار کو پیش کیا کہ آج ہمارا عہد مرثیاتی اشعار کی روشنی سے جگمگا رہا ہے۔

اردو کے تمام معتبر ناقدین نے مرثیہ کو ایک مشکل اور دشوار صنف قرار دیا ہے۔ ان کا مؤقف یہ ہے کہ ایک مرکب صنفِ سخن ہونے کے باعث مرثیہ بے شمار نزاکتوں کا حامل ہے۔ اس صنف کی مبادیات سے بے خبر ناقدین کا مؤقف یہ ہے کہ مرثیہ اس لیے قابلِ گردن زدنی ہے کہ اس کی غلوئی سطح الوہیت سے چھو جاتی ہے میرا واضح مؤقف یہ ہے کہ مبالغہ شعر کی قوت میں اضافے کا موجب بنتا ہے نیز الوہیت کی حدود انسانی تفہیم سے بالا ہے۔ اس صورتِ حال

میں صنفِ مرثیہ سے مبالغہ کو خارج کرنے کا مشورہ دینے والے نافہم ناقدین کی فراست پر افسوس ہوتا ہے۔ جب یہ بات طے ہے کہ حضرات محمدؐ و آلِ محمدؐ کا مقام و مرتبہ انسانی تصور اور فراست سے بھی بالا ہے تو اس مقام کو الوہیت کی حدوں سے ملانے کا دعوے دار کون ہو سکتا ہے؟؟ محمدؐ و اہلبیتِ محمدؐ کی حدوں کو دریافت کر لینے کے دعوے داروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ابھی تو انسان نے مقامِ غلامانِ محمدؐ کو نہیں پہچانا ہے۔ جو کج فہم انسان حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کا عرفان نہ کر سکے وہ عرفانِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کا دعوے دار کیسے ہو سکتا ہے۔

نبیؐ کے وصف کا کرنے چلا ہے اندازہ
جسے خبر ہی نہیں ہے کہ بوذرؓ کیا ہے؟؟

سچی بات تو یہ ہے کہ قلی قطب شاہ سے لے کر **ڈاکٹر ابوالحسن نقوی** تک بلا تخصیص ہر مرثیہ نگار نے حضور اکرمؐ اور ان کے خانوادے کی مدح سرائی کر کے اپنی دنیا اور عاقبت کو سنوارا ہے۔ اگر کوئی مرثیہ نگار اوصافِ اہلبیتؑ کے والہانہ اظہار کی کرامت جاننے کا متمنی ہے تو اسے علم ہونا چاہیے کہ آج اس کا نام محمدؐ و آلِ محمدؐ کی کرامت کے طفیل ہی زندہ، تابندہ اور پائندہ ہے۔

مجھ سے کیا ہوگی محمدؐ کی ثنا خوانی مگر
اس حوالے سے مجھے اپنی بقا درکار ہے

اردو میں صنفِ مرثیہ کو معتبر بنانے والوں میں ایک اہم نام **ڈاکٹر ابوالحسن نقوی** کا بھی ہے۔ وہ ولیوں کے شہر ملتان سے تعلق رکھتے ہیں تاہم آج کل آئرلینڈ میں مقیم ہیں اور طب کے شعبہ میں گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ امر امتنان کا باعث ہے کہ انہوں نے اپنے دیس سے انتہائی دور مقیم ہونے کے باوجود اردو زبان و ادب سے اپنا قلبی تعلق قائم رکھا ہے۔ اردو شعر و ادب سے ان کی والہانہ شیفتگی دیکھتے ہوئے ہم انہیں آئرلینڈ میں "اردو شعر و ادب کا سفیر" قرار دے سکتے ہیں۔ زیرِ مطالعہ مجموعۂ مراثی سے قبل ان کے دو

شعری مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر صاحبانِ دانش سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

زیرِ مطالعہ مجموعۂ مراثی ڈاکٹر ابوالحسن نقوی کی صنفِ مرثیہ سے بے پناہ دلچسپی کا مظہر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ موصوف نے اس صنف کا انتخاب محض اخروی ثواب کے لیے نہیں کیا بلکہ جملہ فنی تقاضوں کو پیشِ نظر رکھا اور اس صنف کو فکری و فنی اعتبار سے وہ مرتبہ عطا کیا کہ آج یہ صنف دوسری اصناف کے مقابل کھڑی ہے اور واقعۂ کربلا کے فیض سے یہ صنف سب سے بڑی فتح کا نقارہ بن چکی ہے۔

کربلا جس کی بلندی ہے وہ مینارہ ہے
مرثیہ سب سے بڑی فتح کا نقارہ ہے

ڈاکٹر ابوالحسن نے ہنوز درج ذیل مراثی تخلیق کیے ہیں۔

• پہلا مرثیہ

۱۔	نام مرثیہ	جنابِ فاطمہ
۲۔	کل بند	۴۶
۴۔	مطلع	ع بعثت سے پہلے بگڑا ہوا تھا ابھی نظام
۵۔	موضوع	حضورِ اکرمؐ کی آمد سے قبل عرب معاشرے میں عورت کی مظلوک الحالی اور ناقدری۔ حضرت فاطمہؑ کی دنیا میں تشریف آوری اور عورت کی عزت و حرمت میں اضافہ۔ کربلا کے میدان میں جناب فاطمہؑ کے خاندان پر ڈھائے جانے والے مظالم کا دردناک بیان۔

• دوسرا مرثیہ

۱۔	نام مرثیہ	قیامِ حسینؑ
۲۔	کل بند	۵۲

۴۔ مطلع — ع بغضِ علی ملوکیتِ وقت چھا گئی

۵۔ موضوع — حضور اکرمؐ کی رحلت کے بعد مسلمانوں کا اہلبیتؑ کے ساتھ افسوس ناک رویہ۔ یزید بن معاویہ کا شیطانی پیکر میں ظاہر ہونا۔ امام عالی مقامؑ کا صبر و استقامت کے ساتھ یزید کو شکست فاش دے کر دین اسلام کا بھرم قائم رکھنا۔

• تیسرا مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — عصمت مآب سیدہ زینبؑ

۲۔ کل بند — ۵۱

۴۔ مطلع — ع عورت کو خلق جب کیا رب کریم نے

۵۔ موضوع — عورت کی عظمت، حضرت زینب سلام اللہ علیہا کا ماں، بیوی اور بیٹی کے روپ میں ظاہر ہونا اور اپنی سیرت و کردار کے انمٹ نقوش ثبت کرنا۔ کربلا کے میدان میں بی بی زینبؑ کا لافانی کردار اور جرأت مندانہ اقدامات۔

• چوتھا مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — العباسؑ

۲۔ کل بند — ۵۷ ،

۴۔ مطلع — ع سچ ہے ازل کے دن ہی سے ہے خود غرض بشر

۵۔ موضوع — ایثار کی فضیلت و اہمیت۔ کربلا کے میدان میں حضرت عباس علمبردار کی ایثار و محبت کی لازوال داستان رقم کرنا۔

• پانچواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ	حضرت علی اکبرؑ
۲۔ کل بند	۴۶
۴۔ مطلع	ع ماں باپ کی دعاؤں کا اولاد ہے ثمر
۵۔ موضوع	حضرت علی اکبر علیہ السلام کے فضائل اور میدان کربلا میں ان پر ڈھائے جانے والے دردناک مظالم اور ان کے اثرات

• چھٹا مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ	سیدہ سکینہ بنت الحسینؑ
۲۔ کل بند	۵۸
۴۔ مطلع	ع عالم میں بی بی صبر کا معیار تری ذات
۵۔ موضوع	حضرت امام حسینؑ کی چھوٹی صاحبزادی بی بی سکینہؑ کی سیرت و کردار کے نمایاں محاسن اور کربلا کے میدان میں ان پر ڈھائے جانے والے دردناک مظالم کی المناک داستان۔

• ساتواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ	حضرت علی اصغرؑ
۲۔ کل بند	۴۱
۴۔ مطلع	ع انسان ہے غریب تو دولت کی ہے طلب
۵۔ موضوع	عصر حاضر کے انسان کی خستہ حالی اور اس سے تدارک کے لیے راہ عمل۔ کربلا کے میدان میں حضرت علی اصغرؑ کی جرأت مندانہ جنگ اور دشمنوں کو شکست فاش

• آٹھواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ　　یا صاحب الزماںؑ

۲۔ کل بند　　۵۶

۴۔ مطلع　　ع　سجدہ ہے آدمی کی عبادت کا افتخار

۵۔ موضوع　　سجدہ کی اہمیت۔ امام آخرالزماںؑ سے کربلا والوں کا پرسہ۔ موجودہ ابتر صورت حال میں امامؑ زمانہ سے دنیا میں تشریف آوری کی التجا

ڈاکٹر ابوالحسن نقوی کے درج بالا آٹھوں مرثیوں کو زیور طبع سے آراستہ کیا جا رہا ہے۔ اُمید ہے کہ ان کا یہ مرثیاتی سفر اسی آب و تاب سے جاری رہے گا۔ اب ذیل میں ان مرثیوں کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

ڈاکٹر ابوالحسن نقوی ایک حساس ذہن کے مالک ہیں۔ وہ بدلتے ہوئے معاشرتی حالات سے دل گرفتہ ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مرثیوں میں معاشرتی کشمکش، سماجی ناانصافی، عدم مساوات، بے جا ظلم و تمرد، سماجی اقدار کی بدحالی اور اخلاقی قدروں کی زبوں حالی کا بیان تواتر سے ہوا ہے۔ وہ عہد جدید کے انسان کی ذہنی اور فکری بدحالی کا رونا روتے ہیں اور اسے حیوان اور شیطان سے بھی کمتر قرار دیتے ہیں۔

انسان دورِ نو کا ہے حیواں سے بھی رذیل
بے رہ روی کا روگ ہے سرطاں سے بھی رذیل
بدکار و بدنسب کی ہے وہ جاں سے بھی رذیل
شیطاں کی پیروی میں ہے شیطاں سے بھی رذیل
انساں کو اس رویے پہ انسان کیوں کہوں
شیطاں سے بھی برا ہو تو شیطان کیوں کہوں

(مرثیہ حضرت علی اصغرؑ)

عصرِ حاضر کا انسان جہاں ایک طرف اخلاقی طور پر تباہ حال ہو چکا ہے وہاں دوسری جانب اس کا معاشی بھرکس بھی نکل گیا ہے۔ ڈاکٹر ابوالحسن نقوی ایک جہاں دیدہ دانش ور کی طرح صورتِ حال کا عمیق نگاہی سے تجزیہ کر کے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں کی تباہی میں جہاں ایک جانب عالمگیر سازشوں کا کردار ہے وہاں دوسری جانب مسلمان خود اپنی تباہی کے ذمہ دار ہیں۔ یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے نام پر قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہو گئی ہے کہ اسلام کی خاطر جان لینے والے تو سرگرم ہیں لیکن حق کی سرفرازی کے لیے اپنی جان قربان کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

بازار قتل گرم ہے مذہب کے نام پر
خودکش دھماکے ہوتے ہیں ہر ایک گام پر
اٹھنے لگی ہیں انگلیاں حق کے نظام پر
قبلہ نہیں رہا یہاں اپنے مقام پر

مظلوم کے لیے نہیں کوئی جو، اب لڑے
حق کے لیے نہیں کوئی نیزے پہ جو چڑھے

(مرثیہ یاصاحب الزماںؑ)

ڈاکٹر ابوالحسن نقوی ایک وسیع تناظر کے حامل تخلیق کار ہیں۔ یورپ میں قیام کے دوران انہوں نے علامہ اقبال کی طرح مغربی معاشرے کے منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں کا عمیق نگاہی سے مطالعہ کیا ہے۔ اہلِ یورپ کل کی طرح آج بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف ہیں۔ یہ امر انتہائی الم ناک ہے کہ بھولے بھالے مسلمانوں نے مغربی سامراج کو اپنا ماڈل بنا لیا ہے اور اہلِ یورپ نے ان کم فہم مسلمانوں کو اپنا آلۂ کار بنا کر ہوا و ہوس کے جال میں جکڑ لیا ہے۔ ڈاکٹر نقوی اس صورتِ حال سے کبیدہ خاطر ہیں اور انہیں احساس ہے کہ مسلمانوں نے ایک جانب تو اسلامی تہذیب و ثقافت سے اپنا رشتہ توڑ لیا

ہے اور دوسری جانب اسلامی تعلیمات ان کے لیے بے معنی ہوگئی ہیں۔ ڈاکٹر نقوی اس صورت حال پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

لالچ مرض وہ ہے نہیں جس کا کوئی علاج
مسجود سب کا بن گیا عالم میں سامراج
کچھ اس طرح بگڑ گیا مسلم ترا سماج
غیر خدا کو سجدہ بنا ہے ترا رواج
خم ہے جبین، ظلم کی یلغار دیکھ کر
سر جھک رہے ہیں جبر کی دستار دیکھ کر

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلمان کسی بھی صورت میں راہ راست پر آ سکتے ہیں......؟؟؟ ڈاکٹر ابوالحسن نقوی کا موقف یہ ہے کہ اُمت مسلمہ کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ انہوں نے اپنے اسلاف کی شاندار اور روشن روایات سے قطع نظر کر لیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مسلمان ظاہری عبادات میں تو مصروف ہیں لیکن اخلاص کی کمی کے باعث ان کی دعائیں بے اثر ہوگئی ہیں۔ وہ خود استفسار کرتے ہیں۔

قرآن بھی وہی ہے تلاوت بھی ہے وہی
روزہ بھی ہے نماز کی عادت بھی ہے وہی
اصحاب باوفا سے عقیدت بھی ہے وہی
کچھ کچھ نبیؐ پاک کی سنت بھی ہے وہی
پھر کیا نہیں ہے آج جو اُمت ذلیل ہے
اسلام کے وقار کی کوئی سبیل ہے؟؟

(مرثیہ یا صاحب الزمانؑ)

ڈاکٹر ابوالحسن نقوی حالات کی یورش سے دل گرفتہ ضرور ہیں لیکن ناامید نہیں۔

انہیں واثق یقین ہے کہ زمانہ ایک مرتبہ پھر حق کی جانب رجوع کرے گا اور اہلِ اسلام محمدؐ و آلِ محمدؐ کی تعلیمات سے بہرہ مند ہو کر پوری دنیا پر حکمران ہو جائیں گے اور،

مظلوم سر اٹھا کے جئیں گے سکون سے
مل جائے گی نجات خرد کو جنون سے
ناحق نہ بھر سکے گا کوئی ہاتھ خون سے
ٹکرا سکے گا کوئی نہ دیں کے ستون سے
ذلت میں گر کے پھر سے سنبھل جائے گا بشر
لالچ کی زندگی سے نکل جائے گا بشر

(مرثیہ یا صاحب الزمانؑ)

ڈاکٹر ابوالحسن نقوی کے تمام مراثی جلیل القدر شخصیات کی سیرت و کردار کی عکاسی کرتے ہیں۔ دانش ور کہتے ہیں کہ جب کوئی معاشرہ روبہ زوال ہوتا ہے تو اس میں سے سیرت و کردار کے علمبردار نمونے (Hero) غائب ہو جاتے ہیں اور ہر شخص بزعمِ خود قابلِ تقلید نمونہ (Role Model) بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر نقوی نے اپنے مرثیوں میں شعوری طور پر ان شخصیات کو موضوع بنایا ہے جو ہم سب کے لیے لائق تقلید و تکریم ہیں۔ جناب فاطمہؑ، حضرت امام حسینؑ، بی بی زینبؑ، حضرت عباس علمبردارؑ، حضرت علی اکبرؑ، بی بی سکینہؑ، حضرت علی اصغرؑ اور امام زمانہ حضرت امام مہدیؑ میں سے ہر فرد عظمت کا کوہسار اور ہدایت کی آبشار ہے۔ حضرت فاطمہؑ، حضرت زینبؑ اور بی بی سکینہؑ عصر حاضر کی خواتین کے لیے حسنِ اخلاق کا بہترین نمونہ ہیں۔ حضرت امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ مردانِ باصفا کے لیے سرچشمۂ رشد و ہدایت ہیں۔ حضرت علی اکبرؑ نوجوانوں اور حضرت علی اصغرؑ بچوں کے لیے نمونۂ حیات ہیں۔ ڈاکٹر نقوی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہر فرد کی سیرت کو اتنے موثر انداز میں اُجاگر کیا ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے اور عام انسان دنیا اور دین میں اُن کی تقلید کو اپنے لیے

باعث فخر محسوس کرتا ہے۔ آپ ان کے مختلف مرثیوں کے صرف تین بند ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ انہوں نے کتنی دانائی اور ہوشیاری سے ہر شخصیت کے خدوخال اُجاگر کیے ہیں اور ہر بند اپنے اندر ایک عہد آفریں پیغام بھی سموئے ہوئے ہے۔

زہراؑ نے تربیت کا وہ معیار دے دیا
ماؤں کو اک نمونۂ کردار دے دیا
عورت کے دل کو جذبۂ ایثار دے دیا
مظلوم کو حسینؑ سا سالار دے دیا
آ جائے گا جو چادر زہراؑ کی چھاؤں میں
لغزش نہ ہو گی ایسے مسلماں کے پاؤں میں

(مرثیہ جناب فاطمہؑ)

پانی کے ساتھ جس نے لہو بھی بہا دیا
عباسؑ نے وفا کا قرینہ سکھا دیا
ہر مفلسِ جہاں کو تونگر بنا دیا
قطرے کو معجزے سے سمندر بنا دیا
باطل کو مومنوں سے کدورت ہے آج بھی
عباسؑ کے عمل کی ضرورت ہے آج بھی

(مرثیہ العباسؑ)

گوہر ہے یہ حسینؑ امامت کے تاج کا
اصغرؑ سے ہے مقابلہ ظالم سماج کا
اب آ گیا سوال رسالتؐ کی لاج کا
بچے کو بھی تھا علم شہِ دیں کے راج کا

دشمن پہ پہلے ہاتھ اٹھاتے نہیں ہیں یہ
میداں میں جا کے پشت دکھاتے نہیں ہیں یہ

(مرثیہ حضرت علی اصغرؑ)

خدائے سخن میر ببر علی انیس نے کہا تھا کہ ''مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے''۔ ڈاکٹر نقوی نے انیسؔ کے اس مشورے پر کما حقہٗ عمل کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مرثیوں کی تمہیدات مختصر ہوتی ہیں۔ تاہم آغاز ہی سے ان کی فضا حزنیہ ہوتی ہے۔ شاعرِ حسینیت حضرت قیصر بارہوی کی طرح ڈاکٹر نقوی بھی اپنے مرثیوں میں حزن وملال کی کئی سطحیں پوشیدہ کر دیتے ہیں اور قاری جیسے جیسے مرثیے کے اختتام کے قریب پہنچتا ہے اسکی آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر نقوی کے تمام مرثیوں میں آپ کو حق و باطل کی ایک آویزش ملے گی۔ اس کشمکش میں آخری فتح حق کی ہوتی ہے اور اس دوران قاری جن الم انگیز کیفیات سے گزرتا ہے وہ بجائے خود ایک ''معرکہ'' ہے۔ اس طرزِ عمل کے دوران اس کا نفسی تزکیہ ہو جاتا ہے اور آنسو بہنے سے دل کی طہارت بھی ہو جاتی ہے۔ آپ ان کے مختلف مرثیوں کے چند بند ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ ابوالحسن نقوی ماحول اور لفظیات سے کس طرح رقت آمیزی پیدا کرتے ہیں:

اصغرؑ کو گرم ریت پہ شہؑ نے لٹایا ہائے
ہاتھوں سے اپنی ننھی لحد کو بنایا ہائے
پھر خوں ٹپکتے جامے میں اس کو اٹھایا ہائے
پھر قبلہ رو لحد میں اسے خود سلایا ہائے
جب اپنا لعل دشت میں دفناتے تھے حسینؑ
غم سے بہت نڈھال نظر آتے تھے حسینؑ

(مرثیہ حضرت علی اصغرؑ)

ہاتھ اپنے رسن بستہ ہیں آپ آ کے چھڑائیں
جس طرح بلاتے تھے مجھے پھر سے بلائیں
نیند آتی ہے سینے پہ مجھے پھر سے سلائیں
میں تھک گئی آ کر مجھے گودی میں اٹھائیں
ہرگز نہ بغیر آپ کے گھر جاؤں گی بابا
گر آپ نہ آئے تو میں مر جاؤں گی بابا

(مرثیہ سیدہ سکینہ بنت الحسین)

مقتل کو گرتے پڑتے شہِ بحر و بر چلے
بیٹے کو دیکھنے کے لیے نوحہ گر چلے
طاقت نہ تھی بدن میں شہِ دیں مگر چلے
میدان سے اٹھانے کو لاشِ پسر چلے
فرماتے تھے صدا تو سناؤ مرے پسر
تم کس جگہ پڑے ہو بتاؤ مرے پسر

(مرثیہ حضرت علی اکبرؑ)

جب قافلہ رواں ہوا کرب و بلا سے آہ
زینبؑ نے غم زدوں کو دیے ہیں دلاسے آہ
بچوں کو وہ بچاتی تھی تپتی ہوا سے آہ
شکوہ کیا نہ رنج و الم میں خدا سے آہ
مشکل میں دینِ حق کی نگہبان بن گئی
مظلومیت کی فتح کی پہچان بن گئی

(مرثیہ عصمت مآب سیدہ زینبؑ)

ڈاکٹر ابوالحسن نقوی کا اسلوبِ بیان انتہائی سادہ، سلیس اور سریع الاثر ہے۔ وہ دل کی بات قارئین کے دلوں تک پہنچانے کے متمنی ہوتے ہیں اور اسی باعث ان کا اسلوب عام فہم ہوتا ہے۔ لفظ شناس ہونے کے باعث وہ اپنے مرثیوں میں خوامخواہ دقیق یا گنجلک الفاظ استعمال کرنے کی کاوش ہی نہیں کرتے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک فکری روشنی ہے جو ہمارے قلب و اذہان کو منور کرتی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر نقوی نے صنائع بدائع اور تشبیہات و استعارات کا برمحل استعمال بھی کیا ہے۔ ان کے مرثیوں میں مستعملہ تراکیب و مرکبات بھی ان کے شعری ذوق اور لفظ شناسی پر دال ہیں۔ آپ ان کے مرثیوں میں استعمال ہونے والی چند اہم تراکیب و مرکبات ملاحظہ فرمائیے۔

فخرِ کردگار، ضربِ ذوالفقار، نطقِ خدا، بازارِ قتل، وارثِ قرآن، سینۂ مومن، خلقِ خدا، شہِ دلدل سوار، گلشنِ زہرا، بادۂ ولایتِ حیدر، فکرِ حسینؑ، حاملِ قرآن، ذکرِ حسینؑ، عظمتِ انسان، اشکِ عزا، فرشِ عزا، دشتِ بلا، کعبۂ سادات، شہِ خستہ جگر، نورِ عین، اہلِ حرم، معراجِ صبر، زینبِ مسموم، کلمۂ فریاد، جاہ و حشم، نوکِ سناں، دامنِ معصوم، عترتِ اطہار، سالارِ قافلہ، چہرۂ اقدس، یومِ عزا، دوپہرِ ملال، صاحبِ زماں، پیامِ محبت، برسرِ پیکار، نوکِ سناں، عیش و طرب، منزلِ یقین، لطف و فضلِ رب، طرزِ جہاد، توقیرِ کائنات، رحلِ پاک، فوجِ شریر، کفارِ کربلا، فوجِ اشقیا، طفلِ امام، چشمِ تر، خیامِ شہ، روحِ باپ، گردنِ صغیر، داورِ محشر، اذنِ جہاد، شہِ اُمم، تیرِ ستمگر، سوئے خلد، سلطانِ کائنات، آرائشِ وفا، آبِ خنک، دشتِ قتال، پارۂ جگر، آفتابِ دشت، پرچمِ عباس، مثلِ ناطقِ قرآن، سرزمین، لشکرِ بد، مرگِ جواں، روزِ حشر، شہِ خوش خصال، چشمِ کرم، باغِ امامت، لشکرِ جفا، سیاہ شام، آثارِ مرگ، چشمِ فلک، شمعِ خلوص، میرِ کارواں، نورِ نظر، رشکِ قمر، پیکرِ انوار، حیاتِ ابدی، شامِ غریباں، ساقیِ کوثر، منظرِ حسرت، توقیرِ رسالت، ویرانیِ صحرا، دیدۂ تر، سرِ انور، گوہرِ نایاب، خوفِ کنیزی، جاپ زنداں، دیدۂ گریاں، عرصۂ آزار، لختِ جگرِ شاہِ مدینہ، سرِ دشت، حرص و ہوس، خصلتِ ایثار، حبِ علم دار، تاریزیدی، قبضۂ شمشیر،

آرائشِ وفا، مفلسِ جہاں، دردو ہجر، اذنِ جہاد، پسِ پردہ، اذنِ آب، اہلِ ستم، دستِ وفا، طاقتِ کمر، سیدِ والا، فرشِ خاک، ہنگامِ عصر، صبر و رضا، اہل و عیال، دشتِ بلا، زیرِ تیغ، منبعِ ایثار، اہلِ شقاوت، لشکرِ باطل، رسمِ عزائی، زیب وزین، مارِ آستیں، توقیرِ کائنات، خوفِ خدا، علم و عمل، دستِ دراز، موجِ جفا، مکروفریب وظلم، زیرِ عتاب، خانۂ بتولؑ، فکرونظر، باعثِ تذلیل، نارِ ہوس، مسیدِ اسلام، مدِ نظر، حفاظتِ امت، بقائے دینِ محمدؐ، بہرِ نجات، قصدِ جنگ، رشکِ قمر، دشتِ مصیبت، سپاہِ فکرِ یزیدی، تصویرِ حق، گریۂ مادر، دشتِ بلا، توحیدِ کبریائی، شترِ بے مہار، بحرِ بیکراں، شکرِ خدا، نمونۂ کردار، جودوکرم، پارۂ جگر، نمونۂ کردار، جذبۂ ایثار، انجامِ زندگی، پیشِ نگاہ، فرطِ الم، نورِ عین، دشتِ پُر فغاں، عصمتِ خدا، تسبیحِ کردگار وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح درج ذیل اشعار میں موجود محاسن شعری بھی دیکھ لیجیے۔

صنعت تضاد

عالم کو آشتی سے بھرے گا علی کا لال
کچھ روز میں عروج میں ڈھل جائے گا زوال

محاورہ

مظلوم سر اٹھا کے جئیں گے سکون سے
مل جائے گی نجات خرد کو جنون سے

تشبیہ

چہرے سے اس کے پنجتنی نور ہے عیاں
لب ہیں کماں کی طرح سے اور تیر ہے زباں

ڈاکٹر ابوالحسن نقوی نے جہاں اپنے مرثیوں کو فکری اعتبار سے زرخیز کرنے کی مشکور سعی کی ہے وہاں ان مراثی کا اسلوبیاتی مطالعہ بھی بے حد دلچسپ ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر نقوی کا اسلوبِ مرثیہ قابلِ توجہ اور لائقِ مطالعہ ہے۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ وہ اصناف جو اپنے عہد کے تقاضوں سے منسلک رہتی ہیں چشم معتبر میں جگہ پاتی ہیں اور ان اصناف سے تعلق رکھنے والے احباب شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار کے حقدار ہو جاتے ہیں۔ یہ بات انتہائی اطمینان کا باعث ہے کہ ڈاکٹر ابوالحسن نقوی نے صنف مرثیہ سے اپنا ناتا جوڑ لیا ہے۔ اب قوی اُمید ہے کہ وہ صاحبان فہم و ذکا کی چشم معتبر میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انہوں نے اپنے مرثیوں میں جس طرح اپنے معاشرتی رویّوں کو جگہ دی ہے اور حقیقی اسلامی تہذیب و ثقافت کو محفوظ کرنے کی بلیغ سعی کی ہے اس کی جتنی بھی مدح سرائی کی جائے کم ہے۔ اُمید واثق ہے کہ ڈاکٹر ابوالحسن نقوی پاکستان سے دور ہونے کے باوجود اُردو زبان اور اسلامی تہذیب و ثقافت سے اسی طرح منسلک رہیں گے اور اپنے شعری افکار سے ہمارے قلوب و اذہان کو معطر کرتے رہیں گے۔ اسی طرح ڈاکٹر نقوی کی محمدؐ و آل محمدؐ سے والہانہ عقیدت و بے لوث محبت کے ثمرات مرثیوں کی شکل میں ہمارے لیے غذائے فکری فراہم کرنے کا سبب بنتے رہیں گے اور ہم ڈاکٹر نقوی کی آواز میں آواز ملا کر اعلان کریں گے کہ۔

قطرے کو اک نظر سے سمندر بنا دیا
میرا تو ان کے در نے مقدر بنا دیا

◆◆◆

maablib.org

◆◆◆

معاشرتی کرب اور ساجد پال ساجد

◆◆

عصرِ حاضر میں تخلیقی سرگرمیوں کے ماند پڑ جانے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اب شاعروں اور ادیبوں کے پاس شاید کہنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ جو شعرا اور ادبا معاشرے کو ''تازہ فکر'' اور ''نئی سوچ'' عطا کرنے کے متمنی ہوتے ہیں ان کے رستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ نقادوں کا معاملہ اس سے بھی زیادہ گھمبیر ہے کہ وہ ہر چیز کو **ٹی ایس ایلیٹ** کے تصورِ روایت کے پیمانے پر ماپنے کی سعی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب آج کے نوجوان شاعر کو غالبؔ اور میرؔ کے شعری اوصاف کے پیمانے سے تولا جائے گا تو وہ یقیناً کم عیار ثابت ہوگا۔ یہ طریقۂ نقد نامناسب ہے۔ عصرِ حاضر کے شاعر کو موجودہ ثقافتی اور سماجی پس منظر میں پرکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات طے ہے کہ اگر آج کا شاعر فکری اور فنی اعتبار سے توانا ہے تو دنیا کا کوئی ناقد اس کی راہ مسدود نہیں کر سکتا۔ یاد رکھیے کہ اگر موسم گل چلا بھی جائے تو اس کی خوشبو سے مٹی تا دیر مہکتی رہتی ہے۔ بقول ساجد پال ساجد ؎

ایک عرصے تک رہے گی خاک میں خوشبوئے گل
موسم گل جائے گا جب شادمانی چھوڑ کر

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نوجوان شعرا کی خامیوں کا تذکرہ تو نہایت شد و مد سے کر۔

دیتے ہیں لیکن ان کے جملہ محاسن پر ہماری جانب سے تحسین و آفرین کی صدا بلند نہیں ہوتی ہے۔اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے بھی کم ظرفوں کا وتیرہ اپنا لیا ہے کہ ہم دوسروں کے عیوب اور اپنے محاسن پر نگاہ رکھتے ہیں۔اگر ہم نے اپنے اس طرزِ عمل کو تبدیل نہ کیا تو آنے والا وقت ہمیں معاف نہیں کرے گا اور ہم ساجد پال ساجد کی آواز میں آواز ملا کر کہیں گے کہ:

سن ذرا آرزو کی سرگوشی
آنکھ میں جل رہی ہے مدہوشی
ایسے سنگین ہو گئے حالات
اور کچھ بڑھ گئی ہے خاموشی
کس نے ہم کو بھلا دیا ساجد
اب ہیں ہم اور خود فراموشی

ساجد پال ساجد ایک بلند قامت شخصیت کے مالک ہیں۔انہیں ادبی ذوق ورثے میں ملا۔درس و تدریس کو پیشہ بنایا۔طالب علمی کے زمانے ہی سے شاعری شروع کر دی اور مختلف علمی و ادبی جرائد میں ان کا کلام زیورِ طبع سے آراستہ ہوتا رہا۔۱۹۹۹ء میں پہلا شعری مجموعہ ''سونمبر'' کے نام سے طبع ہوا اور ۲۰۱۰ء میں ''ابھی محبت کو تھام رکھو'' شائع ہو کر صاحبانِ فہم و ذکا سے داد و تحسین سمیٹ رہا ہے۔انہوں نے معروف ادبی تنظیم ''قصرِ ادب'' لاہور کی بنیاد رکھی اور شعرا و ادبا کی تخلیقی صلاحیتوں کی پذیرائی کی۔ان کے دو شعری مجموعے ''تمہیں کچھ یاد تو ہوگا'' اور ''کبھی ہم چاند ہوتے تھے'' تکمیل کے آخری مراحل میں ہیں۔لطف کی بات یہ ہے کہ اس علمی و ادبی سفر میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے باوجود ساجد پال ساجد عجز و انکسار کا مرقع ہیں اور شاعروں اور ادیبوں پر اپنی جان چھڑکتے ہیں۔ان کے اس خلوص و ایثار کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج علم و ادب ان پر فدا ہیں۔ساجد پال ساجد اس حقیقت سے کماحقہٗ آگاہ ہیں کہ اگر آج انہیں نافہم زمانے نے اہمیت نہ

بھی دی تو آنے والا زمانہ انہیں ضرور اہمیت دے گا۔ کیوں کہ بقول ساجد:

بعد مرنے کے کھلیں دنیا پہ دل کی وحشتیں
عمر بھر تو اس جہاں کی آنکھ سے اوجھل تھے ہم

انسان کی زندگی طرح طرح کے آلام و مصائب میں گھری ہوئی ہے۔ ایک مسئلہ ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا مسئلہ انسانی وجود کو دبوچ لیتا ہے۔ اس کشمکش سے گھبرا کر انسان اپنے اندر سمٹنا شروع ہو جاتا ہے اور جب وہ کھلی آنکھوں سے ماحول کو دیکھتا ہے تو معاشرتی زہر ناکیاں اس کی تخلیقات کا مرکز و محور بن جاتی ہیں۔ ساجد پال ساجد ایک وحشت گرد معاشرے کا فرد ہے تاہم حیرت یہ ہے کہ نہ اس کی آنکھ میں خوف ہے اور نہ دل میں کوئی ملال۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ رجائی نقطۂ نظر کے حامل ہیں اور انہوں نے ایک ایسے مصور کا روپ دھار لیا ہے جو لفظوں سے معاشرے کی تصویر کشی کا فریضہ بطریق احسن ادا کر رہے ہیں۔ حسن و عشق کا پرستار یہ تخلیق کار جب معاشرے کے کسی المیہ کو بیان کرتا ہے تو وفورِ جذبات سے اس کے الفاظ بے قابو ہو جاتے ہیں۔

سیٹھ کو کالی موت نے نگلا
ناگ تھا بیٹھا زر پہ تنہا

....

قہر زدہ اس بستی کا
سارا پانی کھارا تھا

....

دریدہ تن سے جب چھینٹیں اڑیں گے
در و دیوار پہ نقشہ بنے گا

....

اُمڈ آیا ہے سیلاب بلا پھر
جواں لاشوں کا پھر پشتہ بنے گا

بجھ رہا ہے غریب کا چولہا
کیا قیامت ہے کیا گرانی ہے

....

اب چمن زاروں کے ہونٹوں سے دھواں اُٹھنے لگا
آج کا انساں فقط بارود ہو کر رہ گیا
سرکشوں کا تاج ہے وادی کے سبزہ زار میں
جھیل کا پانی لہو آلود ہو کر رہ گیا

....

اُداس بیٹھی ہے تتلی شکستہ پر لے کر
نہ جانے کس نے پروں کا نکھار چھین لیا
گلے میں طوق لیے جل رہے ہیں پروانے
شرار رُت نے زمیں کا فشار چھین لیا

....

جب بستی میں بارود بھرا کرتا ہے نفرت
کیا تم نے وہ دہشت کے ٹھکانے نہیں دیکھے

....

جس نے بھی خریدی ہے یہ آسیب حویلی
روحوں پہ لگے داغ پرانے نہیں دیکھے

یہ اور اس قبیل کے سینکڑوں اشعار ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ ساجد پال ساجد معاشرتی کرب ناکیوں کو بیان کرنا اپنا شعری فریضہ سمجھتے ہیں۔

"ابھی محبت کو تھام رکھو" کے بارے میں ناقدین اور دانشوروں کا عمومی رویہ یہ ہے کہ اس مجموعۂ کلام میں محض حسن و عشق کی لازوال داستانیں پوشیدہ ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس مجموعے کا نقطۂ ارتکاز محبت کے پردہ در پردہ جذبے کو

قرار دیا ہے۔ شہزاد احمد کا مؤقف یہ ہے کہ یہ مجموعہ خوف اور محبت کے جذبات سے پُر ہے۔ ناصر زیدی نے تو اس مجموعے کو ساجد پال ساجد کا پیغام محبت ہی قرار دے دیا ہے۔ خالد شریف نے اس مجموعے کو ساجد پال ساجد کی مظاہر فطرت سے بے مثال محبت قرار دیا ہے۔ خود صاحب کتاب نے اس مجموعہ کے دیباچے ''دو بول محبت کے'' میں واضح کیا ہے کہ ان کا شعری سفر محبت کے باعث ذات سے نکل کر ان دیکھی راہوں کی جانب گامزن ہو گیا ہے۔ تاہم راقم الحروف کا مؤقف یہ ہے کہ ساجد پال ساجد نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو عمومی محبت یا سطحی جذبات کی نذر نہیں کر دیا بلکہ جنون اور محبت کے ارفع جذبات کے ذریعہ معاشرتی بدحالی، بے راہ روی اور غیر اخلاقی رویوں کی بیخ کنی کی مشکور سعی کی ہے۔ یہ امر باعث امتنان ہے کہ وہ معاشرے کے کھو جانے والے سکون کو جنون کے ذریعے واپس لانے کے متمنی ہیں ۔

سکوں جانے کہاں کھونے لگا ہے

جنوں بیدار پھر ہونے لگا ہے

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ باشعور تخلیق کار کا فکری وفنی سفر کم فہم ناقدین کی رکاوٹوں کے باوجود جاری وساری رہتا ہے۔ ساجد پال ساجد اس اعتبار سے ایک اہم شاعر ہیں کہ انہوں نے اپنی شاعری میں معاشرتی زبوں حالی کا مرثیہ نہایت دلگداز انداز میں پیش کیا ہے اور صاحبانِ دانش کو تلقین کی ہے کہ اس بدترین صورت حال سے نکلنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ''ابھی محبت کو تھام رکھو۔''

◆◆◆

◆◆◆

''اعجازِ مودّت'' کی معجز نمائیاں

◆◆

صاحبانِ فہم و ذکا کہتے ہیں کہ مہذب معاشروں میں وہی شاعری پُر تاثیر ہوتی ہے جو ''مقصدیت'' سے مالا مال ہو۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ دانش مندوں کے نزدیک بامقصد شاعری ہی معاشرے کو تہذیب یافتہ کرنے کا موجب بنتی ہے۔ افلاطون سے لے کر مولانا حالی تک تمام معروف کاملین فن نے مقصدیت کو شاعری کا جزوِ اوّل قرار دیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاعری کا بنیادی مقصد کیا ہونا چاہیے؟؟ اس سوال کا جواب ہنوز تشنہ طلب ہے۔ تمام مفکرین نے اپنی اپنی سوچ کے مطابق اس سوال کا کھوج لگایا ہے تاہم کوئی متفقہ اور حتمی جواب ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ میرے خیال میں شاعری کا بنیادی اور اساسی مقصد اعلیٰ اخلاقی اقدار کی تعلیم و ترویج ہے تاکہ کوئی بھی معاشرہ صداقت، خیر اور حُسن کے ستونوں پر کھڑا ہو سکے۔ یہ امر انتہائی امتنان کا باعث ہے کہ جناب ثقلین بخاری نے بھی اپنی شاعری کے ذریعہ حق و صداقت کا علم سربلند کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اپنا سرِ تسلیم وہیں خم کیا ہے جہاں علم و ادب کے اکابرین بھی سر جھکائے کھڑے ہیں۔

دانشورانِ دہر کے سر ہیں جھکے ہوئے
ملتی نہیں نظیر وہ رہبر حسینؑ ہیں

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے در کے غلام ہو جاتے ہیں سرداری و شہنشاہی ان کے

قدم چومتی ہے۔ ثقلین بخاری ایک دور اندیش شاعر ہیں لہٰذا انہوں نے اپنی شاعری کے لیے ایسی گزرگاہ تلاش کی ہے جو مضبوط بنیادوں پر استوار ہے۔ اس کا ایک سرا مخلوق اور دوسرا خالق سے جاملتا ہے۔

دریائے اہلبیتؑ گزرگاہ ہے مری
ثقلین میں سفر نہیں کرتا حباب میں

اعجاز ثقلین بخاری کی شاعری میں محض محمدؐ و آل محمدؐ کے شمائل اور معجزات ہی جلوہ گر نہیں ہیں بلکہ اُس میں ہمارے معاشرے کے ناگفتہ بہ مسائل بھی پیش کیے گئے ہیں۔ عصرِ حاضر کے تمام معروف ناقدین اس امر پر متفق ہیں کہ وہی شاعری عظمت سے ہم کنار ہو سکتی ہے جس کا تعلق سماجیات سے جڑا ہو۔ آپ اعجاز ثقلین بخاری کے درج ذیل اشعار دیکھیے کہ انہوں نے کس طرح ہمارے سماجی مسائل کی پیش کش کی ہے:

جورِ اغیار سے مضمحل قوم ہے
اس کی شدت میں مولاؑ کی چاہیے

....

جو دل میں عشقِ رسالت مآبؐ رکھتا ہے
جہانِ ظلم سے لڑنے کی تاب رکھتا ہے
حسینؑ کے در کی غلامی ہے غم سے آزادی
ہیں حریت کی جہاں میں بقا امام حسینؑ

....

اہلِ دنیا کو ذرا ٹھوکریں کھا لینے دو
دیکھ لینا یہی اپنائیں گے اقدارِ حسینؑ

اعجاز ثقلین بخاری کا وصف خاص یہ ہے کہ وہ چشمِ بینا سے معاشرے کے مسائل و مصائب کا معائنہ کرتے ہیں اور ان کے حل کے لیے مثبت تجاویز دیتے ہیں۔ ان کا واضح موقف یہ ہے کہ

اگر عصرِ حاضر کے انسان امن وسکون کے متلاشی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کا معاشرہ مثالی بن جائے تو انہیں محمدؐ و آلِ محمدؐ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنا چاہیے۔ یہ وہ ذواتِ مقدسہ ہیں جن کے باعث نبضِ کائنات چل رہی ہے اور دہر میں سلامتی کی شمع روشن ہے۔ یہ امر باعثِ امتنان ہے کہ حقوق وفرائض کی معرکہ آرائی میں جادۂ محمدؐ و آلِ محمدؐ پر چل کر ہم دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران ہو سکتے ہیں۔

چھڑتی ہے جب بھی جنگ حصولِ حقوق کی
لگتا ہے ہر محاذ پہ نعرہ حسینؑ کا
ہم چل رہے اس لیے نقشِ حسینؑ پر
جنت سے ہے ملا ہوا جادہ حسینؑ کا

....

آبدیدہ کی رکھ لیجیے آبرو
ہے نگاہ کرم چار سو آپؐ کی
صدقہ حسنینؑ و زہراؑ کا ہو جائے اب
ملتِ بے اماں سرخرو آپؐ کی

اردو شاعری میں طنز کی ایک دیرپا روایت موجود رہی ہے۔ شعرا نے حالات و واقعات کو سدھارنے کے لیے طنز کو بطور حربہ اختیار کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ باکمال شاعر لفظوں کی تیغ سے مکر وریا کے پرخچے اُڑا دیتا ہے۔ اعجاز ثقلین بخاری بھی شعرا کے اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے معاشرے کی ہر قبیح رسم پر طنز کے تیر برسائے ہیں بلکہ انہیں یہ افتخار بھی حاصل ہے کہ انہوں نے تاریخ کو داغدار کر دینے والے کرداروں کی نقاب کشائی بھی کی ہے۔ ان کا یہ طرزِ عمل بنیادی طور پر اصلاحی نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ وہ تاریخ کا سہارا لے کر عصرِ حاضر کے انسانوں کو صراطِ مستقیم کی خبر دیتے ہیں۔ آپ ان کے درج ذیل طنزیہ اشعار ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ انہوں نے شخصی عناد یا ذاتی دشنام طرازی کے بجائے اعلیٰ اخلاقی اقدار کے

فروغ کے لیے اپنی جملہ شعری صلاحیتوں کو استعمال کیا ہے۔

کوئی سنے تو کتاب خدا کی ہے یہ پکار
نبیؐ سے عشق نہیں ہے تو زندگی بے کار

....

نبیؐ و آلِ نبیؐ خوش نہیں تو اے واعظ
نبیؐ کرے گا شفاعت نہ خالقِ جبار

....

پھیکا ہے اجلال و حشم شاہانِ جہاں کا اس کے لیے
کیا خوف جہاں کا اس کو ہو جسے آپؐ سے نسبت ہوتی ہے

....

مسلماں کی اب کفر سے جنگ ہوگی منافق کی خاطر زمیں تنگ ہوگی
شہادت کا جذبہ چھلکنے لگے گا، سراج شہادت علیؑ آ گئے ہیں

....

جبرِ شاہی نہ جس کو توڑ سکا
عزم کیا خوب تھا بہتر کا

....

حاکمِ شام کے دن راتوں میں بدلے ایسے
اس کو رسوائی ملی جگ میں ہے شہرہ تیرا

....

ہو چکا کافی جہاں میں جبرِ چنگیز و یزید
اب حسینؑ ابنِ علیؑ کی حکمرانی چاہیے

....

ہم ان کے ڈر سے ماتمِ شبیرؑ چھوڑ دیں
یہ تو یزیدیوں کے تفکر کی بھول ہے

قلیل ہو کے بھی کثرت سے جنگ جاری ہے
حسینیوں کا زمانے پہ خوف طاری ہے

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ وہی شاعری معاشرے کے لیے مفید اور کارگر ہو سکتی ہے جس میں علوئے فکر اور ارفع مقاصد ہوں۔ اعجاز ثقلین بخاری نے اپنے شعری مجموعے ''اعجاز مودت'' میں ان ذوات مقدسہ کو موضوعِ سخن بنایا ہے جو موجبِ تخلیقِ کائنات ہیں اور ان کا طرزِ عمل اپنا کر ہم دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محمدؐ و آلِ محمدؐ کی پوری حیاتِ طیبہ ایک ایسے روشن اور تابناک جادے کی طرح ہے جس پر رواں دواں رہ کر ہم دنیا و آخرت میں کامگار ہو سکتے ہیں۔ اعجاز ثقلین بخاری نے عمیق نگاہی سے ان حضرات کی سیرتِ مبارکہ کو معطر زبان میں ہمارے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر لی ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم ان اشعار پر محض ''واہ'' ''واہ'' نہ کریں بلکہ ان پر عمل پیرا ہو کر ''اعجاز مودت'' کے معجزوں سے لطف اندوز ہوں۔ میرے نزدیک ''اعجاز مودت'' کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ یہ ہم جیسے عام انسانوں کو بھی شام ظلمت سے نکال کر کربلا و نجف کے سویروں تک پہنچا دیتی ہے۔

اعجاز کیوں میں شام کی ظلمت سے اب ڈروں
آنکھوں میں ہوں نجف کا سویرا لیے ہوئے

◆◆◆

تعیّنات

(مضامین)

کٹر سیّد شبیہ الحسن

تعیّنات

(مضامین)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

تعیّنا

(مضامین)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الح

تعیّنات

(مضامین)

کٹر سیّد شبیہ الحسن

تعیّنات

(مضامین)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

تعیّنا

(مضامین)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الح

تعیّنات

(مضامین)

کٹر سیّد شبیہ الحسن

تعیّنات

(مضامین)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

تعیّنا

(مضامین)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الح

تعیّنات

(مضامین)

اکٹر سیّد شبیہ الحسن

تعیّنات

(مضامین)

ڈ کٹر سیّد شبیہ الحسن

تعیّنا

(مضامین)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الح

تعیّنات

(مضامین)

اکٹر سیّد شبیہ الحسن

تعیّنات

(مضامین)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

تعیّنا

(مضامین)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الح

تعیّنات

(مضامین)

اکٹر سیّد شبیہ الحسن

تعیّنات

(مضامین)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

تعیّنا

(مضامین)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الح

تعیّنات

(مضامین)

اکٹر سیّد شبیہ الحسن

تعیّنات

(مضامین)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

تعیّنا

(مضامین)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الح

تعیّنات

(مضامین)

اکٹر سیّد شبیہ الحسن

تعیّنات

(مضامین)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

تعیّنا

(مضامین)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الح

تعیّنا

تعینات

مضامین

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن

گزشتہ دنوں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر سہیل احمد خاں اور ڈاکٹر وزیر آغا وفات پا گئے تو خدشہ ظاہر کیا گیا کہ اردو تنقید کے میدان میں پاکستان میں اب جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ کبھی پورا نہیں ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ متذکرہ ممتاز نقادوں میں سے ہر شخص یکتا اور فرد فرید تھا لیکن قدرت کے بھید نرالے ہیں اور وہ ارتقا کے سلسلے کو جاری رکھتی ہے۔ 'تعینات' کے مصنف ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو میں قدرت کا ایسا ہی کرشمہ سمجھتا ہوں جو دامان ادب کی خالی جگہ کو اکرام و تزئین سے پر کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ اپنی اعلیٰ ادبی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں اور زندگی کے متعدد پرکشش اور دلفریب گوشوں سے نظر بچا کر صرف اور صرف ادب سے لو لگاتے اور ادب کی بہ صداقت خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں۔

گزشتہ صدی کے ربع آخر میں مجھے لاہور میں قیام کا موقع ملا۔ اس شہر بے مثال کی ادبی مجالس میں بے شمار ادیبوں سے ملنے کی سعادت حاصل ہوئی اور ہر ادیب نے اس نو وارد غریب شہر کو اپنے علم و فضل اور دانش و ہنر سے متاثر کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن واحد ادیب تھے جو ادبی محفلوں میں کم کم نظر آتے اور اپنے کنج تنہائی میں گم رہتے۔ سینئر ادیبوں کی پذیرائی اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے۔ مطالعہ ان کی عادت اور تنقید پہلی محبت ہے۔ ادب کے اس دریائے رواں سے اب ایک نئی کتاب 'تعینات' کے نام سے برآمد ہوئی ہے اور اس میں انہوں نے اپنے کعبہ دل سے ان ادیبوں کو بازیافت کیا ہے جو ان پر آیتوں کی طرح اترے ہیں۔ آخری حصے میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تنقید کی بوطیقا شامل ہے اور اس کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے اپنے دلکش اسلوب سے تنقید و تحقیق کو تخلیق کا درجہ دیا ہے اور مصنف کے باطن سے اس کا تخلیقی جوہر تلاش کرنے کی کاوش کی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے ادب کے منور و تاباں ماضی کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے لیکن اس کتاب میں فوقیت زمانہ حال کو دی ہے اور دریافت و بازیافت کا عمل عصر حاضر کے ان ادیبوں پر آزمایا ہے جنہیں تسلیم کرنے میں آج کا تنگ نظر نقاد گریزاں ہے۔ شاید یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ جن تخلیق کاروں پر کسی نے نہیں لکھا ان پر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے کشادہ نظری سے قلم اٹھایا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ مستقبل کی تابانی ان کے معاصرین کے فن سے عبارت ہے۔ میں اس نئی کتاب 'تعینات' کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

ڈاکٹر انور سدید

۲-اپریل ۲۰۱۱

۱۷۲-ستلج بلاک

علامہ اقبال ٹاؤن لاہور پاکستان

۰۴۲-۳۷۸۰۰۸۳۰